عربی کے مشہور راوی ابونواس نے ایک بوڑھے باغبان کا ذکر کیا ہے جس کا شگفتہ باغ اُجڑ چکا تھا اور جس کے ماتمِ حسرت کا یہ حال تھا کہ گلیوں اور کوچوں میں آوارہ گردی کرتا اور جب کبھی کوئی سبز پتہ یا سُرخ پھُول نظر آجاتا تو بے اختیار چیخ اٹھتا کہ :

"ہائے میرا شگفتہ اور سرسبز و شاداب باغ !"

یہی حال ہمارا ہے ۔ ہمارے اقبال و عروج کا باغ اجڑ چکا ہے ۔ اس کے بڑے بڑے شاداب تختے تاراجِ خزانِ غفلت و طوفانِ انقلاب ہو چکے ہیں ۔ تاہم ابھی اس کی یاد باقی ہے اور ہم اس کی دلفریب بہاروں کو کسی طرح نہیں بھلا سکتے ۔

اب بھی جب کبھی ترقی یافتہ قوموں کے باغ و بہار کی سیر کرتے ہُوئے کوئی شگفتہ ورقِ گل نظر آجاتا ہے تو ابونواس کے ماتم زدہ باغباں کی طرح اپنے اقبالِ رفتہ کو یاد کر لیتے ہیں کہ :

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی !

۱۰ ۔ جون ۱۹۱۳ء ابوالکلام آزاد

طابع :- محمد شفیق کیفی
مطبع :- چٹان پریس - آردو پریس
بار اول :- نومبر ۱۹۵۹ء
قیمت :- تین روپے بارہ آنے

تاریخی شخصیتیں

ابوالکلام اکیڈمی

سادات سٹریٹ میکلوڈ روڈ۔ لاہور



بہادر شاہ ظفر



★

ابو عبداللہ

★



اگر

ممکن ہوتا

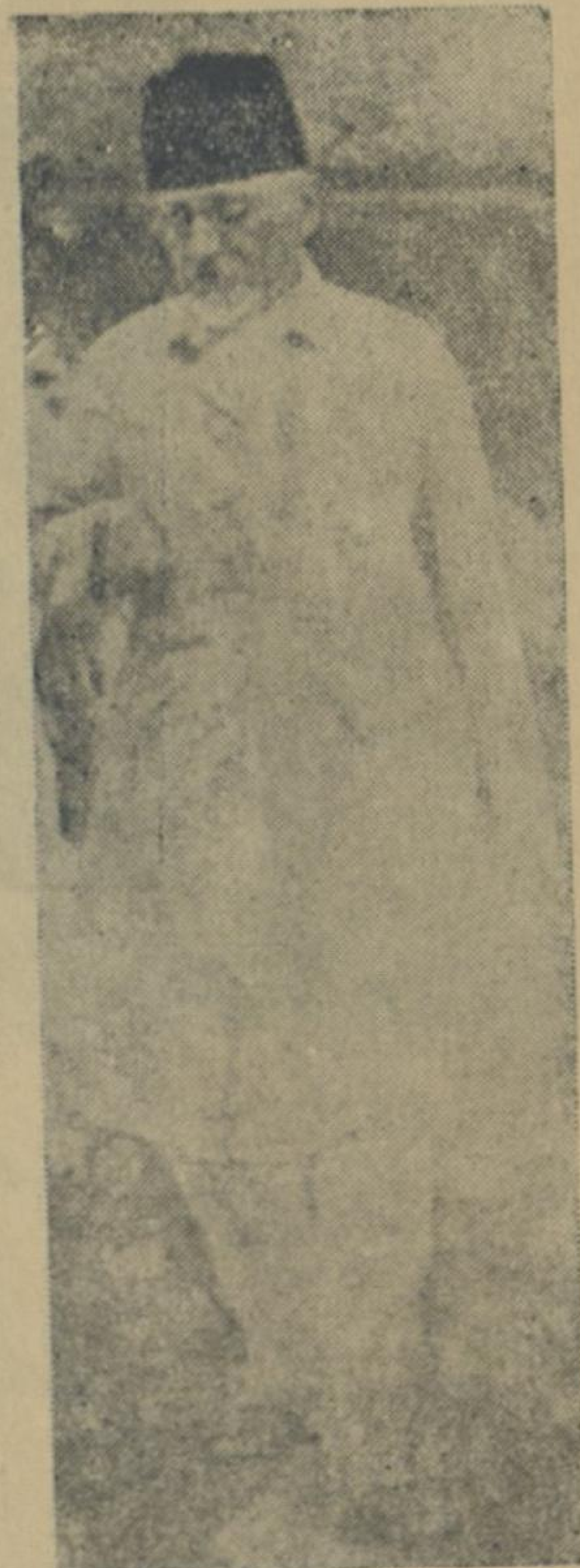
تو

ہم اپنے اقبالِ رفتہ کا ایک مرقع اتم کھینچتے

اور اس میں

▲ بغداد کے معتصم — ▲ اندلس کے ابو عبداللہ اور — ▲ دہلی مرحوم کے بہادر شاہ کو پہلو بہ پہلو جگہ دیتے تاکہ کبھی گاہ گاہ نظرِ حسرت ڈال لیتے اور زخم ہائے کہنہ کو کبھی کبھی نشترِ غم سے چھیڑ دینے کے لئے سامانِ عبرت و درد فراہم ہو جاتا

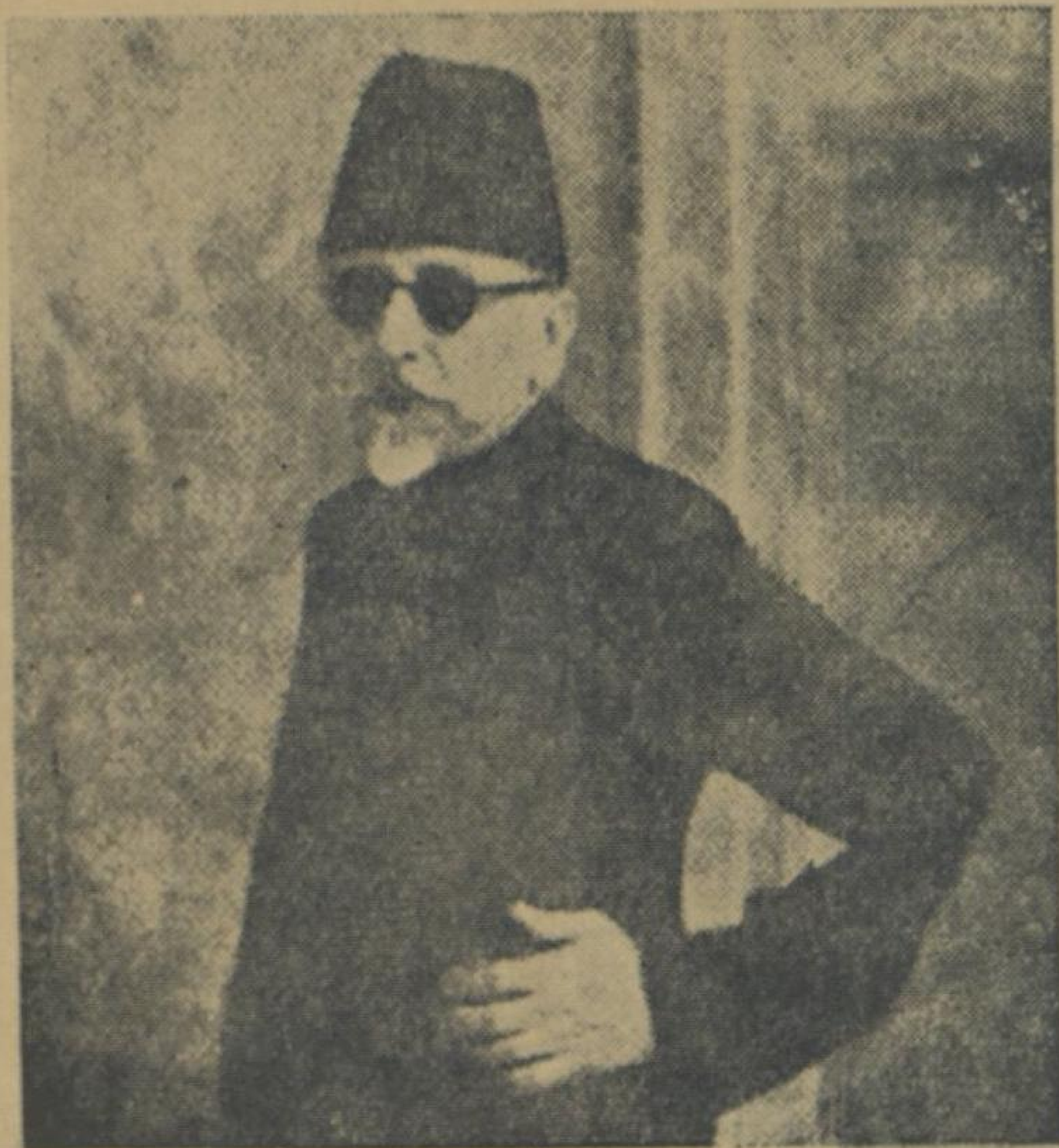
یہ تین شخصیتیں دراصل ہماری عظمتِ ماضی کے تین افسانے ہیں"



"ہر قوم کی تاریخ میں اس حالت کی مثالیں ڈھونڈھی جا سکتی ہیں۔ قومی عروج کے زمانے پر نظر ڈالو گے تو وہ سراپا عمل نظر آئے گی لیکن تنزل کا عہد دیکھو گے تو عمل کی جگہ تخیل کی فرمانروائی ہو گی۔ پہلی حالت میں تخیل محدود مگر قدم بے روک ہوتا ہے دوسری حالت میں قدم رک جاتا ہے مگر خیال آسماں پیمائیاں شروع کر دیتا ہے" ؞

ابوالکلام

ترتیب



"زندگی کتنی ہی شاندار اور عظیم ہو لیکن تاریخ اپنے
فیصلہ کے لئے ہمیشہ موت کی منتظر رہتی ہے۔" ابوالکلام

حکایتِ برق و خرمن



مصنف کی دوسری کتابیں

۱ - تذکرہ

۲ - غبار خاطر

۳ - ترجمان القرآن

۴ - انسانیت موت کے دروازے پر

۵ - کاروان خیال

۶ - تحریک آزادی

۷ - ام الکتاب

۸ - درس وفا

حکایتِ برق و خرمن

میرے اجزائے فکر اور اوراقِ نظر کی پریشان حالیوں کا بھی کچھ عجیب حال ہے
علم کی زندگی سیاست کی زندگی ہے کچھ اس طرح مختلف واقع ہوئی ہے کہ دونوں
کا ایک وقت اور ایک محل میں جمع ہونا بہت مشکل ہے۔ میری زندگی کی مشکلات
میں پہلی مشکل یہ واقع ہوئی کہ میں نے چاہا دونوں کو بہ یک وقت اور بہ یک محل
جمع کر دوں:-

پنبہ را آشتی ایں جا بہ شرار افتاد ست!

دراصل ذوق کی وسعت طلب کی عدم قناعت، نظر کی بلند پیمائیاں، اور
فکر کی مشکل پسندیاں نہ تو ایک راہ پر صبر کر سکتی ہیں نہ سہل و آسان
روشیں اختیار کر سکتی ہیں۔ دنیا نے فکر و عمل کے الگ
الگ گوشے بنائے ہیں، اور استعداد و صلاحیت کے دائرے بنا کر ان میں لکیریں

کھینچ دی ہیں تاکہ تقسیم عمل کے حدود قائم ہو جائیں۔ لیکن یہ تقسیمیں اور حد بندیاں ہمیشہ نہیں چل سکتیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ طبیعت کا جوش اور فکر کی وسعت ان چھوٹے چھوٹے خانوں کی تنگ نائیوں میں قانع نہیں رہ سکتی، اور حد بندیاں توڑ کر باہر نکل جاتی ہے۔ میں فکر کی یکسوئی اور ایک ہی راہ پر پڑ جانے کی آسانیوں سے بے خبر نہیں ہوں لیکن کیا کروں؟ مبدءِ ازل نے طبیعتیں تقسیم کرتے ہوئے مجھ نامراد کے لئے یہی پسند کیا کہ ہر راہ کی پیمائش اور ہر کوچے کی گردش کا اضطراب اس میں ودیعت کر دیا جائے۔ علم کا استغراق اور سیاست کی خود فروشیاں دنیا کے لئے متضاد ہیں تو ہوں، لیکن میرے لئے تو ایک ہی دماغ کا سودا اور ایک ہی دل کی تپش تھی۔

روئے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

جہاں تک بن پڑا، آب و آتش کی اس یک جائی اور برق و خرمن کی اس ہم آمیزی میں کوتاہی بھی نہ ہوئی۔ سیاسی زندگی کی سرگردانیاں کیسی ہی سخت کیوں نہ رہی ہوں لیکن ذہن و فکر کی مشغولیتوں میں کبھی خلل نہ ڈال سکیں۔ لوگوں نے گوشہ ہائے چمن کے سکون اور کتب خانوں کے بے خلل استغراق میں علم و نظر کے مرحلے طے کئے ہیں۔ لیکن یہاں جو کچھ پیش آیا، یہ تھا کہ سیاسی و ملکی صف آرائیوں کے ہنگامے تھے، یا نظر بندی کی سختیاں اور قید خانے کی کوٹھڑیاں تھیں۔ تاہم دماغ اپنے کاموں میں مشغول اور فکر اپنی کاوشوں میں سرگرم تھا۔

تا دستِ رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

لیکن اس کارخانۂ طبیعت میں کوئی چیز بھی اپنے قدرتی خواص معطل نہیں کر دے سکتی ۔ برق کے لئے گرنا اور خرمن کے لئے جلنا ناگزیر ہے ۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ایک طرف ذوقِ علم کاغذ و قلم کے انبار لگا رہا تھا، تو دوسری طرف سیاسی مشغولیت کی آتش فروزیاں بھی اپنے کام میں سرگرم تھیں ۔

متاعی جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا

۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۲۱ء تک یکے بعد دیگرے اس طرح کے حالات پیش آتے رہے کہ ایک طرف میں اپنا سرمایۂ فکر جمع کرتا جاتا تھا ۔ دوسری طرف دستبردِ زمانہ انہیں پوری بے دردی کے ساتھ منتشر کرتا جاتا تھا، اور چونکہ یہ خود اپنی اختیار کردہ زندگی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس لئے صبر کے سوا چارہ کار بھی نہ تھا ۔

ایں کار چو خود کردم با خویش چہ گلہ کردم؟

۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۱ء تک

۱۹۱۶ء میں جب بنگال سے مجھے خارج کیا گیا، اور رانچی گیا، تو یہ وہ وقت تھا کہ البلاغ اور دار الارشاد کی مشغولیت کے ساتھ میں نے اپنے افکار و تحقیقات کی تحریر و ترتیب بھی شروع کر دی تھی، جن امور کی تکمیل و ترتیب پیش نظر تھی، وہ کسی ایک ہی موضوع سے تعلق نہیں رکھتے تھے ۔ بے شمار گوشے سامنے آتے تھے، اور ہر گوشۂ نظر میں اس کثرت سے متفرق اور منتشر حقیقتیں نمایاں ہوتی تھیں کہ ان سب کا جمع کرنا، اور اصول و کلیات کے ماتحت لانا آسان نہ تھا ۔ ضرورت تھی

کہ سو صنہ تک فکر و کاوش کا معاملہ جاری رہے بہت سی چیزیں ابتدائی شکل میں مرتب پڑی تھیں۔ بہت سی ناتمام تھیں۔ برسوں سے دماغ اس کا عادی ہو گیا ہے کہ ہمیشہ کبھی نہ کبھی گوشۂ تحقیق کی فکر او کبھی نہ کبھی عقدۂ کار کے حل میں مشغول رہتا ہے، اور اس لئے بے شمار یادداشتیں جو فی الحقیقت کسی نہ کسی معاملۂ علم و تحقیق کی اصولی بنیادیں ہوتی ہیں۔ قلم سے نکلتی رہتی ہیں اُس وقت تک کم از کم ایک ہزار چھوٹے بڑے پرچے تو صرف یادداشتوں ہی کے سیاہ ہو چکے ہوں گے۔

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں!
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

یہ تمام ذخیرہ، دماغ کا حاصل اور زندگی کا سرمایہ تھا۔ اس میں سے کچھ تو میں اپنے ساتھ رانچی لے گیا تھا۔ باقی حصہ کلکتہ کے سکونتی مکان میں چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُس وقت حالات کی رفتار کچھ عجیب طرح کی تھی۔ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ مستقبل میں کیا پیش آئے گا۔ لیکن جب پانچ ماہ کے بعد حکومت ہند نے میری نظر بندی کے احکام جاری کئے، تو ایک ہی وقت میں رانچی اور کلکتہ، دونوں جگہ خانہ تلاشی کی گئی، اور پھر اس وقت سے لگاتار سلسلہ اس کا جاری ہو گیا۔ رانچی میں دو مرتبہ اور کلکتہ میں تین مرتبہ یہ معاملہ پیش آیا۔ کلکتہ میں صرف میرے سکونتی مکان اور مطبع ہی کی تلاشی لی گئی بلکہ ان تمام مکانات کی بھی لی گئی جہاں کوئی ادنیٰ سا شبہ بھی میرے کاغذات کی موجودگی کا ہو سکتا تھا۔ کاغذات زیادہ تر متفرق مسوّدات تھے، یادداشتیں تھیں مجمل اشارات تھے۔ میں عموماً یادداشت فارسی میں یا عربی میں لکھا کرتا ہوں۔ کیونکہ اردو میں اختصار ممکن نہیں۔ تلاشی کا کام زیادہ تر

انگریز حکام یا بنگالی ماتحتوں کے ذمہ تھا۔ اگر ان میں کوئی مسلمان تھا بھی تو ٹوٹی پھوٹی اُردو کے سوا کچھ نہیں جانتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر کاغذ پر اسرار اور ہر سطر سیاسی راز بن گئی۔ اور سب کو ایک ڈھیر کی شکل میں جمع کر کے قبضہ میں لے لیا گیا۔ کاش! احتیاط کے ساتھ جمع کرتے اور احتیاط کے ساتھ رکھتے۔ لیکن ان میں کون تھا جسے ان چیزوں کا درد ہوتا؟ نتیجہ یہ نکلا کہ نصف سے زیادہ اوراق تو تلاشی کے وقت کی بے احتیاطیوں میں ضائع گئے۔ اور نصف جو باقی رہے، انھیں بھی اس بے احتیاطی کے ساتھ اِدھر اُدھر جوڑ دیا گیا کہ کوئی ایک چیز بھی اپنی اصلی شکل میں باقی نہ رہی۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ یہ برباد شدہ ذخیرہ بھی پورا واپس نہیں ملا۔ جو کاغذات کلکتہ سے لیے گئے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ دنوں تک پولیس کمشنر کے دفتر میں رکھے گئے۔ "اتفاقاً" وہاں کے ایک گوشہ میں آگ لگ گئی اور دفتر کے سامان کے ساتھ بعض اوراق بھی جل گئے۔ پولیس کے دفتر میں آگ بھی لگی تھی۔ تو اسی وقت، جب یہ دفتر پریشان وہاں جمع تھا۔

گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

ان مسودات میں حسب ذیل کتابیں ایک حد تک مرتب تھیں:۔

تاریخ معتزلہ۔ سیرۃ شاہ ولی اللہ۔ دیوان غالب اردو پر تبصرہ۔ خصائص مُسلم۔ امثال القرآن۔ شرف جہاں قزوینی پر تبصرہ۔ مقدمۂ تفسیر کے ناتمام اجزاء۔ ترجمان القرآن کا مسودہ سورۂ "ہود" تک۔ تفسیر البیان سورۂ نساء کے ابتدائی حصّہ تک۔ مضامین اور یادداشتوں

کا ذخیرہ ان کے علاوہ ہے۔ قیام رانچی کے ابتدائی زمانے میں دو رسالے نئے لکھنا شروع کیے تھے۔ ایک وحدۃ قوانین کائنات پر۔ دوسرا قانون انتخاب طبیعی اور معنویہ کائنات پر۔ ان کے اوراق بھی اسی ذخیرہ میں شامل ہو گئے۔

اس کے بعد رانچی کی زندگی میں وہاں کی مقامی خدمات سے جسقدر وقت بچا، تصنیف و تالیف میں صرف ہوا۔ مقدمہ، ترجمہ اور تفسیر کے بارے میں بہت سی تبدیلیاں فکر و خیال میں ہو گئی تھیں۔ تقریباً از سر نو کام شروع ہوا تھا۔ جنوری ۲۰ء میں اپنا تمام نیا ذخیرہ لے کر رانچی سے نکلا۔ اس مرتبہ ارادہ کر لیا تھا کہ کم از کم ترجمان القرآن کسی نہ کسی طرح شائع کر دینا چاہیئے۔ اسی خیال سے متن قرآن کی کاپیاں ایک دوست عزیز نے اپنے اہتمام و صرف سے لاہور میں لکھوائیں اور ترجمہ کی کتابت کا کام بھی ستمبر ۱۹۲۱ء میں شروع ہو گیا۔

اگر پانچ چھ ماہ تک بھی یہ حالت باقی رہتی تو باوجود ہر طرح کی سیاسی مشغولیت کی سرگرانیوں کے، عجب نہیں کہ کسی نہ کسی طرح یہ ایک چیز مکمل ہو جاتی۔ لیکن اُسے کیا کیجئے کہ اگر ایک طرف ان خرمن سازیوں اور سرمایہ اندوزیوں کی کوششیں جاری تھیں۔ تو دوسری طرف نگاہ برق کی دعوت میں بھی کوتاہی نہیں ہو تی تھی۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو میں گرفتار ہوا، اور پھر خانہ تلاشیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مختلف اغراض سے (جن کی تشریح کا یہ موقعہ نہیں) پے در پے "تلاشیاں" لی گئیں۔

نتیجہ یہ نکلا کہ نہ صرف بے شمار مسودات و اوراق بلکہ کتابت کی ہوئی کاپیوں کا بھی تمام ذخیرہ پریشان و منتشر ہو کر پولیس کے قبضہ میں چلا گیا۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۳ء کو جب رہا ہو کر واپس آیا تو ۱۹۱۶ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک کی تمام محنت تقریباً رائگاں ہو چکی تھی۔

ومتیٰ یساعدنا الوصال ودھرنا   یومان، یوم نوی ویوم صدود

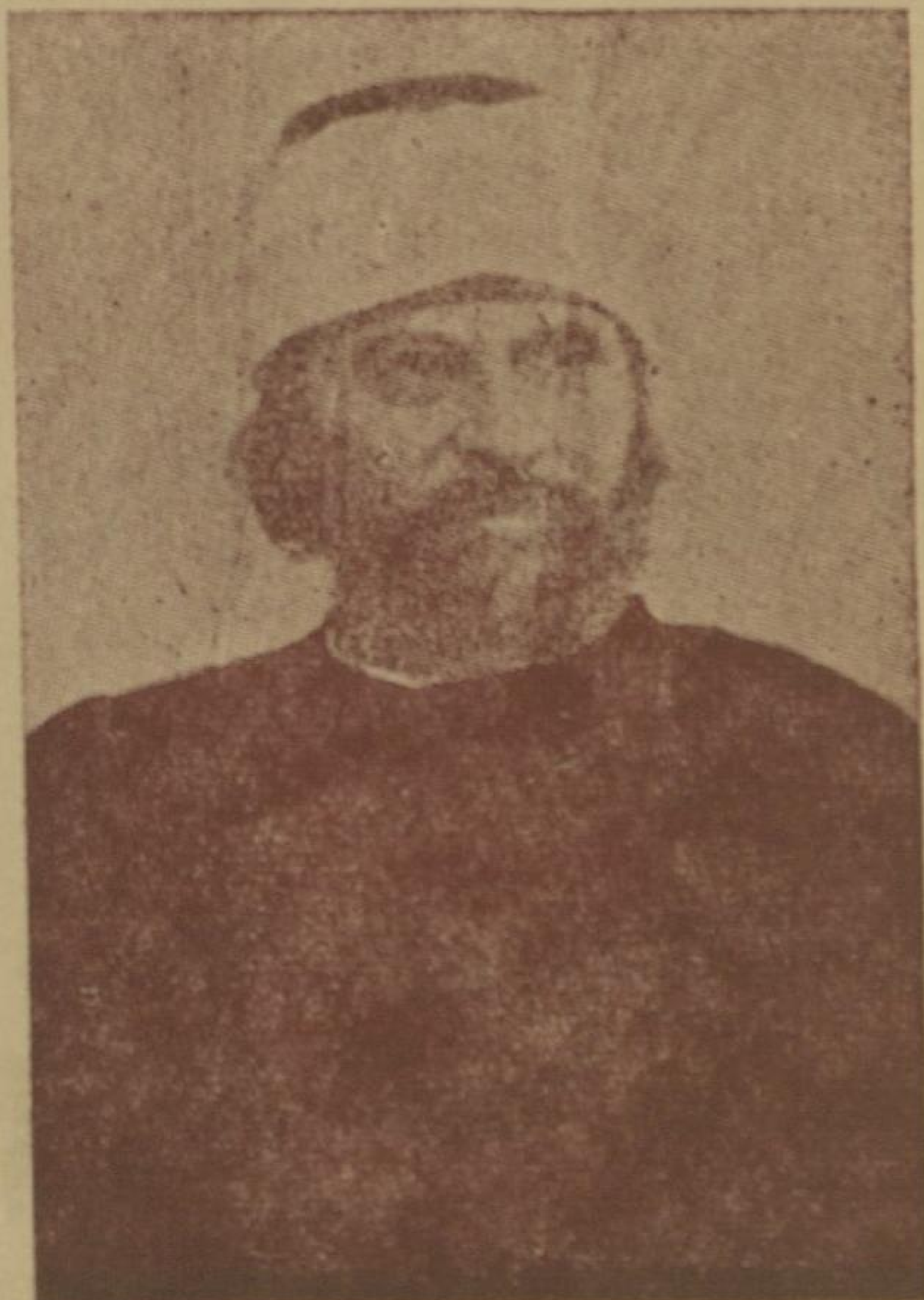
عرصہ کی ردوکد کے بعد اوراق واپس ملے، لیکن تمام تر ناقص منتشر اور برباد شدہ تھے۔ اب بغیر نئی محنت کے ان کا کوئی حصّہ بھی کام نہیں دے سکتا تھا۔ یہ بربادی پہلی بربادی سے بھی زیادہ ہمت شکن تھی۔ لیکن چونکہ خود اختیاری حالات کا نتیجہ تھی اس لیے جس طرح پہلی مرتبہ صبر و خاموشی کے ساتھ برداشت کر لی گئی تھی اس مرتبہ بھی برداشت کر لینی پڑی۔ حتیٰ کہ آج سے پہلے شاید اس کا تذکرہ بھی قلم و زبان سے آشنا نہیں ہوا۔

جن لوگوں کو تصنیف و تالیف کے معاملات کی خبر ہے وہ جانتے ہیں کہ ایک مفکر اور اہلِ قلم کے لیے یہ بات کتنی مشکل اور اذیت دہ ہوتی ہے کہ اپنی لکھی ہوئی چیز برباد دیکھے اور دوبارہ قلم اٹھانے پر مجبور ہو۔ مشہور ہے کہ جب کارلائل کی تاریخ انقلابِ فرانس کا مسودہ جل گیا تو عرصہ تک اس کا یہ حال تھا کہ قلم پکڑتا اور بغیر ایک حرف لکھے چھوڑ دیتا۔ کارلائل کا حادثہ اتفاقی تھا۔ اس لیے اسے شکایت زیب دیتی تھی اور اس کی بے تشکیبی بھی قابلِ ملامت نہیں۔ لیکن

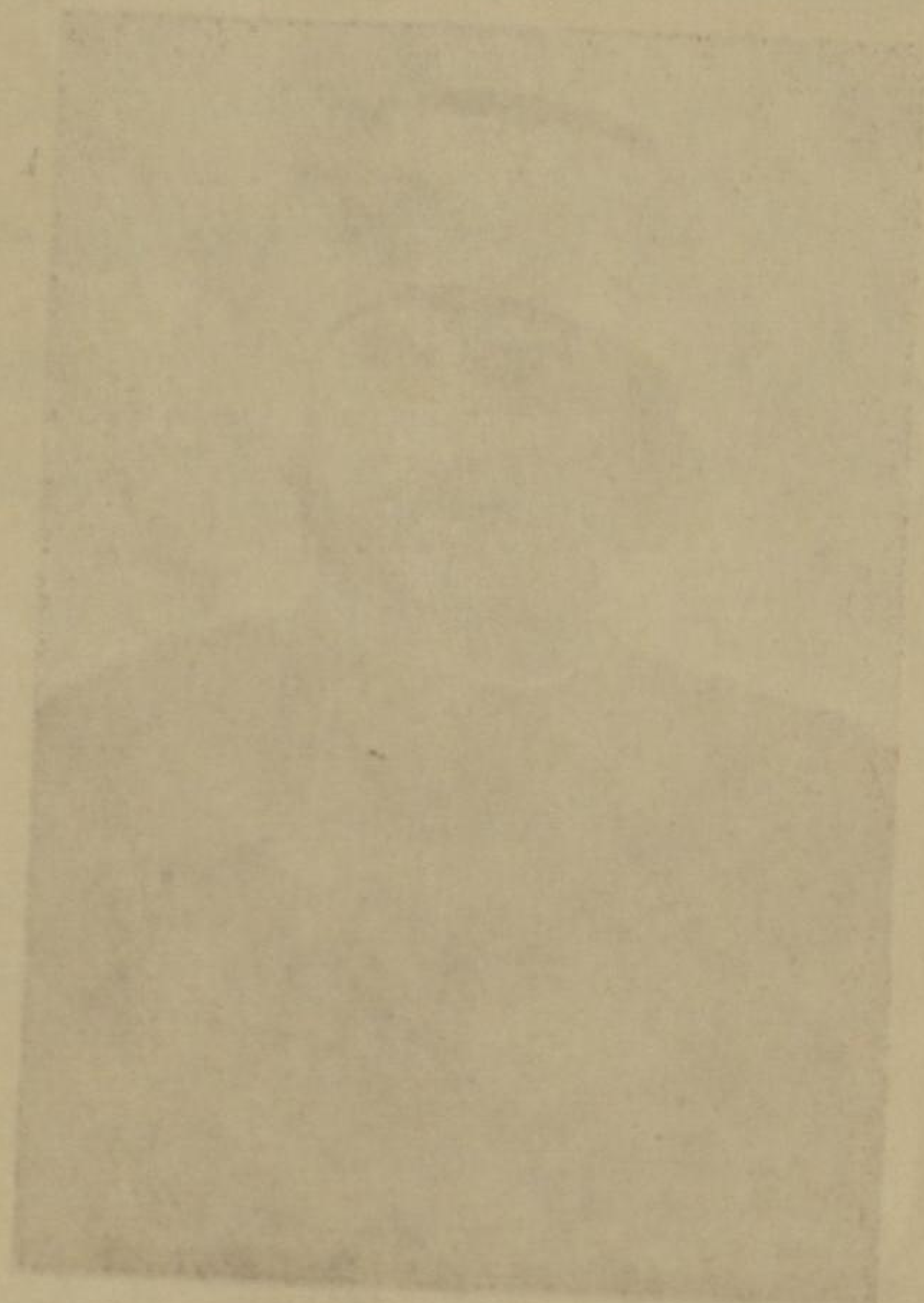
مجھے جو حوادث پیش آئے، اتفاقی نہ تھے۔ اختیاری تھے۔ اس لیے دل کے لیے کتنے ہی دردانگیز اور ہمت شکن ہوں، لیکن دماغ کے لیے ان میں کوئی وجہ شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے دونوں مرتبہ تسلیم کر لینا پڑا کہ یا تو اس طرح کی زندگی اختیار نہیں کرنی تھی یا کی ہے تو پھر اس کے تمام لازمی نتائج گوارا کر لینے چاہئیں۔ سرمد کا فیصلہ صرف ایک گزشتہ عشق ہی کا نہیں بلکہ انسان کی تمام مصیبتوں کے لیے عام و ابدی فیصلہ ہے:

یا تن بہ رضار دوست می باید داد
یا قطع نظر زیار می باید کرد

ابوالکلام آزاد



سید جمال الدین اسد آبادی



سیّد جمال الدّین (افغانی) اسد آبادی

قومی و شخصی اولوالعزمیوں کا کوئی واقعہ ہو، مگر اس کے نظارے ہیں کوئی دیسی ہی اپنی گزری ہوئی یاد ضرور پاتے ہیں۔ آج یورپ کے سیر فی الارض اور سیاحت و سفر کا دور ہے۔ کرۂ ارضی کے گوشے گوشے کو متلاشیان علم و حقائق نے چھان ڈالا ہے۔ افریقہ کے لق و دق صحراؤں کی پیمائش ہو چکی ہے۔ نائجیریا اور سوڈان کے وحشی حصوں میں سیاحان مغرب کے صدہا قافلے گزر چکے ہیں۔ قطب شمالی و جنوبی کی مہموں کی سرگزشتیں سب کے سامنے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں، تہارو متلاطم سمندروں کی ناپیدا کنار موجیں، صحراؤں اور میدانوں کی مہلک اور خوفناک روائتیں، زندگی کا فطری عشق اور نفس کی سحرانہ دامنگیریاں، کوئی چیز بھی ان کے شوق سفر اور ہوائے تحقیق کے لئے مانع نہیں ہو سکتی۔ یہاں تک کہ قافلے کے قافلے لٹتے ہیں۔ جہازوں کے جہاز ڈوبتے ہیں، صدہا سیاح مفقود الخبری یا موت اور تباہی سے

دو چار ہوتے ہیں۔ تاہم ہر بربادی خوف کی جگہ ایک عزیمت ، اور ہر ناکامی بے ہمتی کی جگہ ، اور زیادہ تحریک و دلولہ کا کام دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ مقامات تک ان سیاحوں کے حملوں سے محفوظ نہ رہے۔ جہاں اجنبیوں اور غیروں کے لئے موت اور تباہی کا اعلان صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

ایک وقت تھا کہ ہمارے سیاحان ارض اور جہاں نوردان علم کا بھی یہی حال تھا۔ ان کے ولولۂ سیاحت کے لئے بھی کوئی روک مانع کار نہ تھی۔ ان کے عشق جہاں پیمائی کا مرکب بھی بحر و بر کے چپے چپے پر سے گزر چکا تھا۔ چونکہ ان کے تمام کاموں کا مرکز تعلیم اسلام ، اور ان کے ہر جذبے کے اندر حکم الٰہی کی اطاعت و فرمانبرداری کام کرتی تھی ، اسلئے جس طرح وہ اپنے گھروں کے اندر بیٹھ کر خدا کی عبادت کرتے تھے۔ بالکل اسی طرح خدا کی زمین میں بھی پھر کے اور اس کے پیدا کردہ سمندروں اور پہاڑوں پر سے گزر کے اس کے حکموں کی تعمیل کرتے تھے۔ اور جسم و اعضاء کی عبادت کے ساتھ فکر و ذہن کی بھی عبادت انجام دیتے تھے

دنیا میں کون مذہب ہے جس نے عام روحانی احکام کے ساتھ ساتھ سیر و سیاحت پر بھی اس طرح جا بجا زور دیا ہو۔ حالانکہ قرآن حکیم ہر جگہ کہتا ہے کہ "سیروا فی الارض" زمین میں پھرو اور سفر کرو تاکہ تمہیں بصیرۃ و حکمت حاصل ہو۔

اس سے بڑھ کر سیر و سیاحت اور سیروا فی الارض کے لئے اور کیا حکم ہو سکتا تھا؟ اسی حکم ربانی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانان

مسلمان چند صدیوں کے اندر ہی اندر تمام دنیا کے گوشوں گوشوں میں پھیل گئے اور کبھی "طارق فاتح" نے اپنا گھوڑا مغرب و مشرق کے درمیان نئی سمندر میں ڈال کر جبل الطارق پر علم توحید نصب کیا۔ اور کبھی "بیرونی" نے شوق علم و تحقیق میں عرب و عجم کے دشت و جبل طے کر کے ملتان اور پنجاب کی متعصب اور پرخطر سرزمین کو برسوں تک اپنا موطن و ملجا بنائے رکھا!

مسلمانوں کی سیر و سیاحت کے واقعات اگر قلم بند کئے جائیں تو ایک بہت بڑی ضخیم مجلد صرف اسی موضوع پر مرتب ہو جائے دنیا کا چپہ چپہ ان کی سیر و سیاحت کا شاہد ہے مغرب و مشرق کے ہر حصے میں اسلام کے آثار خالدہ ان کی جہاں نوردیوں کا افسانہ سنا رہے ہیں۔ ابن حوقل، البیرونی، ابن جبیر، ابن بطوطہ علامہ مقدسی، اور قزوینی صاحب آثار البلاد کے سفرنامے اور تصنیفات اب تک دنیا کے علمی ذخیرہ کا سرمایۂ ناز ہیں۔ ابو العباس نباتی کا تذکرہ تاریخوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ جس نے فن طب کی تکمیل اور مفردات و عقاقیر کی تدوین کے لئے آٹھ مرتبہ مشرق و مغرب کا سفر کیا۔ پھر ان فدا کاران راہ تبلیغ حق اور مبشران صداقت و ہدایت کا شمار تو ممکن ہی نہیں، جو پیغام توحید لے کر اپنی سرزمینوں سے اٹھے اور دنیا کے بڑے بڑے حصوں کو مسخر کر لیا۔

لیکن افسوس کہ اب یہ ذکر ہمارے چہروں پر نہیں کھلتا ہماری موجودہ حالت

تمام خصوصیات ملی و اسلامی سے محروم ہے۔ ہم میں قرآنی خصائص اور ربانی اعمال بالکل مفقود ہو گئے ہیں۔ اب ہم میں نہ وہ "راکعون الساجدون" ہیں۔ جو "آمرون بالمعروف" اور "ناہون عن المنکر" تھے۔ اور نہ وہ "سائحون العابدون" ہیں۔ جو خدمت انسانیت وکشف حقائق و سرائر کی راہ میں ارض الٰہی کی سیر و سیاحت کرتے تھے۔ ہم غیروں میں ان ولولوں کو دیکھ کر متعجب ہوتے ہیں حالانکہ دنیا کے لئے تعجب و تحیر کا تماشہ کبھی ہماری ہی اولوالعزمیوں اور سرگرمیوں کے اندر تھا۔

تقریباً دو ماہ گزرے ہیں کہ ایک شخص سید جمال الدین نامی سے میری ملاقات ہوئی (یہ ملاقات مولانا ابوالکلام آزاد سے ۲۶ر اگست ۱۹۲۷ء کے دو ماہ قبل ہوئی)، اس شخص کی شخصیت کا میرے دماغ پر جو اثر پڑا، وہ ایسا ہے جو بہت کم شخصیتیں مجھ پر ڈال سکی ہیں، یہ اثر بہت قوی اور گہرا تھا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ مجھے خیال ہوا، سوربون یونیورسٹی کے خطبات کا موضوع یہ قرار دوں۔ کہ "اسلام اور اس کا علم سے علاقہ"۔ سید جمال الدین کی ذہنیت ایک ایسی ذہنیت ہے جو رسمی اسلام کے موثرات کی پوری طرح مقاومت کر سکتی ہے۔ میں جب اس شخص سے باتیں کر رہا تھا تو اس کے افکار کی آزادی طبیعت کی فضیلت، اور اظہار حقیقت کی جرأت دیکھ کر مجھے خیال ہوا۔ میں اس وقت ان مشاہیر عالم میں سے کسی ایک کو مخاطب کر رہا ہوں۔ جو دنیا کے گزشتہ علمی زمانوں میں گزر چکے ہیں اور جن سے تاریخ کے ذریعہ ہم نے واقفیت حاصل کی ہے۔ میں گویا

ابن سینا، ابن رشد، یا ان حکماء عظام میں سے کسی حکیم کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا، جنہوں نے فکر انسانی کو جہل و اوہام کے قیود سے نجات دلانے کے لیے تاریخ عالم کی پانچ صدیوں تک اپنی شجاعانہ جدوجہد جاری رکھی تھی۔

سیّد جمال الدّین

انیسویں صدی کی تاریخ مشرق نے اصلاح و تجدد کی جس قدر شخصیتیں پیدا کی ہیں ان میں کوئی شخصیت بھی وقت کی عام پیداوار سے اس قدر مختلف اور اپنی طبعی ذہانت اور غیر اکتسابی قوتوں میں غیر معمولی نہیں ہے، جس قدر سید جمال الدین کی شخصیت ہے۔ بغیر کسی تامل کے کہا جا سکتا ہے کہ مشرق جدید کے رجال تاریخ اور قائدین فکر کی صف میں اُس کی شخصیت کسی اعتبار سے اپنا سہیم و شریک نہیں رکھتی۔

وہ ایک گمنام اور مجہول ماحول میں پیدا ہوا۔ ایسے مجہول ماحول میں کہ آج تک یہ بات بھی قطعی طور پر معلوم نہ ہو سکی کہ وہ فی الحقیقت باشندہ کہاں کا تھا، اسعد آباد کا جو ہرات کے قریب اور افغانستان میں واقع ہے۔ یا اسد آباد کا جو ہمدان کے قریب اور ایران میں واقع ہے؟

اُس کے وطن کی طرح اس کی ابتدائی زندگی کے حالات پر بھی ظن و تخمین کے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ تعلیم و تربیت کا اسے کوئی موقعہ ایسا نہیں ملا تھا جو کسی اعتبار سے بھی ممتاز اور قابل ذکر ہو۔ انیسویں صدی کے کال تنزل یافتہ افغانستان اور پنجاب کے علما اپنے گھروں اور مسجدوں میں علوم رسمیہ کی جیسی کچھ تعلیم دیا کرتے تھے، ویسی وہ

سے زیادہ تعلیم جو اس نے حاصل کی تھی وہ وہی تھی جن استادوں سے اس نے تعلیم حاصل کی وہ بھی یقیناً معمولی درجہ کے تھے۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی علمی شخصیت قابل ذکر ہو۔

دنیا کے نئے تمدنی انقلاب اور نئے علوم سے آشنا ہونے کا بھی اُسے کوئی خاص موقع حاصل نہیں ہوا تھا اور اس کا ابتدائی زمانہ زیادہ تر افغانستان میں بسر ہوا، یا ایک روایت کے مطابق ایران میں، اور یہ دونوں مقامات اس وقت مغربی تمدن و علوم کی تعلیم و تعلم کا کوئی سامان نہیں رکھتے تھے

صحبت اور معاشرت بھی اکتسابی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ بلکہ بسا اوقات درس و تدریس کی باقاعدہ تعلیم سے بھی کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک اس کی زندگی کے حالات روشنی میں آئے ہیں، کوئی قرینہ اس کا موجود نہیں۔ کہ اُسے مشرق وایشیا کی عام مقلدانہ و رسمی سطح سے کوئی بلند درجہ کی صحبت ملی ہو۔

سیر و سیاحت بھی ذہن کی نشو و ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہے، لیکن اس نے اپنی ابتدائی زندگی میں ہندوستان اور حجاز کے سوا اور کسی مقام کا سفر نہیں کیا تھا۔ ظاہر ہے ان دونوں مقامات میں کوئی سرچشمہ ایسا موجود نہ تھا جس سے ایک مجتہدانہ فکر و نظر کی پیدائش ہو سکے انیسویں صدی کے اوائل میں ان مقامات کا تعلیمی تنزل منتہائے کمال تک پہنچ چکا تھا۔

سب سے زیادہ کہ اُس نے جتنی بھی اور جیسی کچھ بھی تعلیم حاصل کی تھی، وہ وہی تعلیم تھی جو بجائے خود مسلمانوں کے ذہنی تنزل کی پیداوار ہے اور کئی صدیوں سے اسلامی دنیا کے دماغی تنزل کا سب سے بڑا سبب بن گئی ہے اس تعلیم سے ذہن و فکر کی تمام قوتیں پژمردہ ہو جا سکتی ہیں لیکن آزادانہ نشو و نما نہیں پا سکتیں۔

بایں ہمہ وہ ۱۸۷۱ء میں جب کہ اس کی عمر بمشکل تیس برس کی ہوگی یکایک قاہرہ میں نمایاں ہوتا ہے، اور صرف چالیس دن کے قیام سے اس عظیم مشرقی دارالحکومت کے تمام علمی حلقوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کی "عجیب اور نئی قسم کی علمی قابلیتوں" کی شہرت دارالخلافہ قسطنطنیہ تک پہنچتی ہے۔ اور اس کی تمام اصلاحی اور انقلابی قوتیں نمایاں ہو جاتی ہیں!

وہ ادب عربی کا ایک عجمی متعلم تھا جس نے بعید ترین عجمی ممالک میں عجمی اساتذہ سے ناقص اور گمراہ قسم کی ادبی تعلیم حاصل کی تھی، لیکن وہ عربی زبان کے سب سے بڑے مرکز، قاہرہ میں سب سے پہلے صحیح و صالح فن عربیہ کا درس دیتا ہے۔ اور عربی کتابت و تحریر کا ایک بنا دور پیدا کر دیتا ہے، آج مصر و شام کے تمام مشاہیر اہل قلم اعتراف کرتے ہیں کہ کتابت عربیہ میں ہم سب اسی عجمی کے عیال ہیں "موجودہ عہد میں عربی کا سب سے بہتر کاتب شیخ محمد عبدہ تھا۔ اور وہ اسی کا شاگرد تھا!"۔

اس نے علوم حکمیہ کی جس قدر بھی تعلیم حاصل کی تھی، وہ وہی موجودہ مدارس عربیہ کے متون و شروح کی عقیم و کج اندیش تعلیم تھی۔ لیکن وہ ذہین و مستعد طلبا کی ایک جماعت منتخب کر کے علوم حکمیہ کا درس و املا شروع کر دیتا ہے، اور قدیم معقولات کی وہ تمام گرہیاں ایک ایک کر کے واضح کرتا ہے جن کے اعتقاد و جمود نے صدیوں سے مشرقی دنیا کا ذہنی ارتقا معطل کر دیا ہے۔

مذہب اور علم، دونوں میں اس کی مصلحانہ ذہنیت نمایاں ہوتی ہے۔ اور کسی گوشہ میں بھی اس کے قدم وقت کی مقلدانہ سطح سے مس نہیں ہوتے۔ سیاست میں وہ سرتاپا انقلاب کی دعوت ہوتا ہے، اور جہاں کہیں جاتا ہے چند دنوں کے اندر مستعد اور صالح طبیعتیں چن

کر انقلاب و تجدد کی روح پھونک دیتا ہے۔ اس نے بیک وقت مصر، ایران اور عراق، تینوں مقامات میں اصلاح و انقلاب کی تخم ریزی کر دی!

وہ اپنے اوّلین قیام مصر سے تقریباً بارہ برس بعد پہلی مرتبہ یورپ کا سفر کرتا ہے، اور پیرس میں وقت کے سب سے بڑے فلسفی اور علم و دین کی نام نہاد نزاع میں سب سے بڑے حریف دین و مذہب، پروفیسر رینان سے ملتا ہے وہ پہلی ہی ملاقات میں اس "عجیب الاطوار مشرقی فیلسوف" سے اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ اخبار طان میں سید موصوف کے ایک مقالہ کا وہ ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"میں نے اس کی شخصیت میں ابن سینا اور ابن رشد کی روح دیکھی" جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ انسان کی قابلیت کیسی ہی کیوں نہ ہو لیکن مخاطب کے تاثر کے لئے وہ بہت کچھ قوت بیانیہ اور فصاحت تکلم کا محتاج ہوتا ہے۔ جس وقت سید جمال الدین رینان، سے پیرس میں اور لارڈ سالسبری سے لندن میں ملا ہے۔ اس وقت اس کی فرانسیسی زبان کی تعلیم کی تاریخ صرف اتنی تھی۔ کہ اثنار قیام مصر میں ایک شخص سے لاطینی الف بے تلمی لکھوا لی تھی، اور پھر کچھ عرصہ کے بعد ایک کتاب خرید لی تھی۔ جو عربی میں فرانسیسی کی ابتدائی تعلیم کے لئے لکھی گئی تھی۔ کوئی ثبوت موجود نہیں۔ کہ اس نے نے کسی انسان سے باقاعدہ فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کی ہو، لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ فرانسیسی زبان میں بہتر سے بہتر تحریر و تقریر کر سکتا تھا۔ ترکی، روسی اور انگریزی بھی اسی طرح اس نے سیکھ لی تھی۔

مشہور ہے۔ کہ جب پیرس میں روسی سفیر نے اُس سے ملنا چاہا۔ تو اس نے ملاقات

کی تاریخ ایسی مقرر کرائی۔ جو دو ہفتہ بعد آنے والی تھی۔ اس کے بعد وہ ایک کتب فروش کے یہاں گیا۔ اور اس سے کہا: "مجھے فرانسیسی میں روسی زبان سکھانے والی کتاب چاہیئے میں خرید لوں گا۔ بشرطیکہ تم اس کا بھی انتظام کر دو۔ کہ آج سے ایک ہفتہ بعد کوئی روسی زبان بولنے والا آدمی مجھ سے ملاقات کر سکے"۔ کتب فروش نے کتاب بھی دی، اور ایک ایسے شخص کا انتظام بھی کر دیا جو اسی کے یہاں ملازم تھا۔ جمال الدین نے ایک ہفتہ تک بطور خود کتاب دیکھی، پھر آٹھویں دن سے چودھویں دن تک روزانہ ایک گھنٹہ روسی سے باتیں کیں۔ اور پندرھویں دن وہ تیار ہو گیا تھا۔ کہ روسی سفیر سے بغیر کسی مترجم کی وساطت کے ملاقات کرے۔

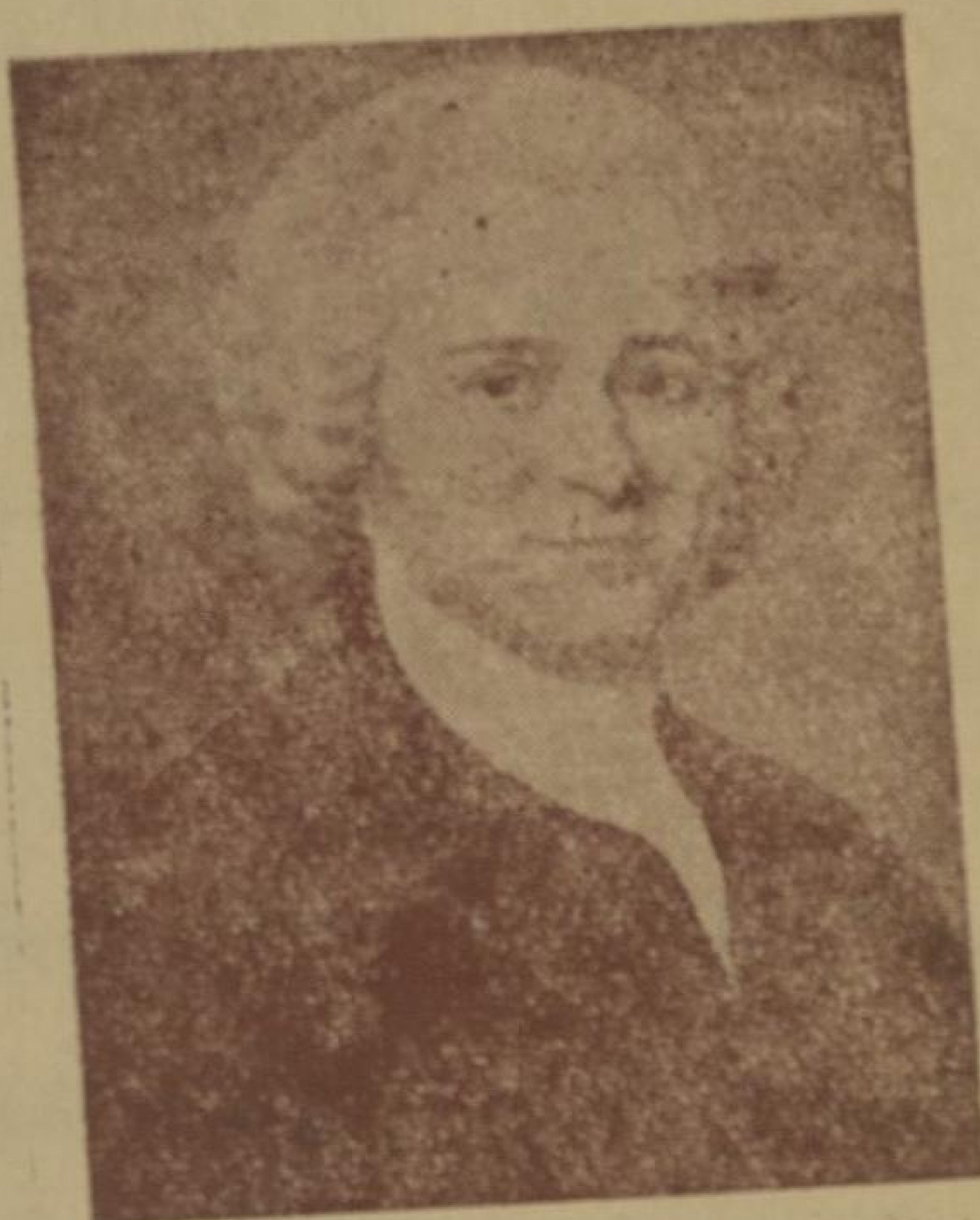
سیّد کے سوانح حیات

اگر سید جمال الدین کی زندگی میں لوگ اُس کے حالات سے واقف نہ ہو سکے۔ تو یہ چنداں عجیب بات نہیں ہے۔ دنیا نے ہمیشہ اپنے اکابر و اعاظم سے ان کی زندگی میں غفلت برتی ہے، اور جب تک وہ دنیا سے رخصت نہیں ہو گئے ہیں، اُن کے حقوق کا اعتراف نہیں کیا ہے۔ خصوصاً مصلحین و مجددین اُمم کے لیے تو زندگی میں تغافل اور موت کے بعد تعظیم و احترام، اس دنیا کا ایک عام اور غیر متغیر قانون ہے۔ لیکن یہ صورتِ حال کس درجہ عجیب اور تاسف انگیز ہے۔ کہ اس کی وفات کو پورے تیس برس گزر چکے ہیں، اور وہ تمام مشرقی ممالک بیدار ہو چکے ہیں جہاں اس نے اصلاح و انقلاب کی ابتدائی تخم ریزی کی تھی تاہم اس کی زندگی بدستور تاریخ کی روشنی سے محروم ہے۔ اور رائی سے

زیادہ مشرق کچھ نہیں جانتا، جتنا یورپ کے بعض محبِ مشرق اہلِ قلم نے بتلا دیا ہے!

افسوس اس جہل و غفلت پر! ہم صرف اپنے قدماء کی شناخت ہی کے لئے یورپ کے محتاج نہیں ہیں۔ بلکہ اپنے عہد کے اہل فضل و کمال کے لئے بھی اس کے محتاج ہیں، جب تک وہ انگلی سے اشارہ کر کے نہ بتلا دے، ہم خود اپنی قوم اور عہد کے بڑے بڑے انسانوں کو بھی نہیں پہچان سکتے!

ہندوستان میں "الہلال" کی اشاعت سے پہلے، غالباً لوگ سید جمال الدین کے نام سے بھی آشنا نہ تھے۔ ۱۸۷۹ء میں جب وہ حیدر آباد اور کلکتہ میں مقیم تھا، تو ہندوستانی مسلمانوں میں سے صرف ایک شخص یعنی مرحوم عبد الغفور شہباز تھا، جسے اس کے فضل و کمال کی تھوڑی سی شناخت نصیب ہوئی تھی، اور اس کے چند فارسی مقالات کا اردو ترجمہ شائع کیا تھا!"



جان جاک روسو

جان جاک رُوسو

"دنیا میں ہر شخص کا ایک کام ہوتا ہے۔ میرا کام یہی ہے کہ میں تلخ مگر مفید سچائی عوام پر ظاہر کر دوں۔ جہاں تک میری استطاعت میں تھا، میں نے انسانیت، شرافت اور رواداری کی دعوت دی ہے۔ اگر دنیا نے نہیں سنا تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے اپنے لئے ایک قاعدہ بنا لیا ہے۔ میں عالمگیر سچائیوں کا ساتھ دوں گا۔ میں کسی پر الزام نہیں لگاتا۔ کسی کی تضحیک نہیں کرتا۔ کسی معیّن شخص پر حملہ نہیں کرتا میرا حملہ انسانوں پر ہے۔ میں کسی خاص فعل کو برا نہیں کہتا۔ میں شر کو برا کہتا ہوں۔"

ایک مرتبہ ایک مجلس میں انگریزی علم ادب کا غیر معمولی انسان اور انقلاب فرانس کا سب سے بہتر وقائع نگار، کارلائل موجود تھا۔ لوگ حکما کی خیالی تفشہ کشیوں پر بحث کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کہا۔" اجتماع و معاشرت کے انقلابات کے نقشے ایک دل خوش کن تخیل سے زیادہ نہیں ہیں۔" جونہی اس رائے زنی کی بھنک

کارلائل کے کانوں میں پڑی، اس نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا۔

حضرات کچھ عرصہ گزرا، اس دنیا میں ایک شخص تھا روسو۔ اس نے ایک کتاب لکھی تھی۔ جب یہ کتاب شائع ہوئی تو بہت سے آدمیوں نے اس کی ہنسی اڑائی لیکن جب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس کی جلد باندھنے کے لئے انہیں لوگوں کے جسم کا چمڑا استعمال کیا گیا تھا جنہوں نے اس کی ہنسی اڑائی تھی۔"!

یہ ہے یورپ کے اٹھارھویں صدی کی عجیب و غریب شخصیت جان جاک روسو اور یہ ہے اس کی انقلاب انگیز اور عالم افگن تعلیمات کا ساحرانہ نفوذ، جس کی طرف کارلائل نے ان ضرب المثل بن جانے والے لفظوں میں اشارہ کیا تھا!

نپولین کہا کرتا تھا۔" انقلاب فرانس کچھ نہ تھا۔ مگر روسو"۔ ایک اور موقعہ پر اس نے کہا۔" روسو ہی انقلاب کا باپ تھا" بلا شبہ روسو انقلاب فرانس کا باپ تھا۔ لیکن وہ اس سے بڑھ کر تھا۔ اس نے صرف فرانس ہی میں نہیں بلکہ اپنے پورے عہد کی عقلی و اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اس کے مبادیات و اصول کو لوگ صحیح سمجھیں یا غلط۔ لیکن علمی دنیا کا فیصلہ یہی ہوا کہ وہ آنکھ بند کر کے اسی کی رہنمائی پر چل پڑی، اور اس کے سوا دوسروں کی رہنمائی کرنے سے انکار کر دیا۔ اٹھارھویں صدی سے لے کر اس وقت تک دنیا کے قوموں کی حکومتوں میں، ان کی سوسائٹی اور معاشرت میں، ان کے عقلی اعمال و عقائد میں، ان کے علم و فن کے کاروبار میں ایک بہت بڑی زندہ حقیقت روسو اور روسو کے اصول و مبادی ہیں!

مختصر حالات زندگی

سنہ ۱۷۱۲ء میں روسو جینوا میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ آیزنگ روسو ایک غریب آدمی تھا۔ مگر سست ناکارہ اور بداخلاق، گھڑیوں کی مرمت کرتا۔ اور عورتوں کو ناچنا سکھا کر پیٹ پالتا۔ لیکن اس کی ماں بہت شریف عورت تھی۔ اس کی شرم و حیا اور شریفانہ نسوانی جذبات کا تمام سوانح نگاروں نے اعتراف کیا ہے روسو میں اپنے ماں اور باپ، دونوں کے اخلاق جمع ہو گئے تھے۔ البتہ بعد میں اس نے بہت کچھ اصلاح کر لی تھی۔

روسو کی ابتدائی تعلیم نہایت ناقص تھی۔ اسے بچپن ہی سے افسانے اور خیالی قصے پڑھنے کا شوق ہو گیا تھا لیکن اس کے تمام سوانح نگار تسلیم کرتے ہیں کہ یہ مطالعہ اس کے عجیب ذہن کے لئے مضر نہیں بلکہ مفید ثابت ہوا۔

روسو ابھی پوری طرح جوان نہیں ہوا تھا کہ اپنی روزی کمانے پر مجبور ہو گیا۔ اس کے والد نے اسے دستکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ مگر اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ کئی مقامات پر اس نے نوکری کی، مگر اپنی "تنگ مزاجی اور خاص قسم کی طبیعت کی وجہ سے کہیں جم نہ سکا۔ نہ وہ اپنے کسی آقا کو خوش کر سکتا تھا۔ نہ اس کا کوئی آقا اسے مطمئن کر دینے کی قابلیت رکھتا تھا"

اپنی زندگی کا یہ زمانہ اس نے سخت مصائب میں گزارا۔ تنگ دستی ہمیشہ اس کی رفیق رہی۔ بے اطمینانی نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا۔ صحبت نہایت خراب تھی۔ سوسائٹی

کا سب سے زیادہ بدترین طبقہ اس کے حصے میں آیا تھا۔

ترقی و شہرت کا پہلا موقعہ

۳۹ سال اس طرح گزر گئے۔ اب تک وہ بالکل گم نام تھا۔ لیکن قدرت کی نظرِ عنایت اس پر شروع ہی سے تھی۔ وہ ۱۵ سے اسے اپنے مدرسۂ مصائب میں تیار کر رہی تھی۔

۱۷۴۹ء میں اچانک اس کے اقبال کا ستارہ طلوع ہوا۔ فرانس کے ایک علمی مجمع (اکاڈیمی) نے ایک موضوع مقرر کیا۔ اور اہل علم کو اس پر بحث کی دعوت دی۔ مقابلہ سخت تھا۔ منتخب علماء میدان میں اتر پڑے تھے۔ تاہم روسو نے ہمت کی اور مضمون لکھا۔ اس کا مضمون سب سے بہتر ثابت ہوا۔ مجمع علمی نے اس گمنام "عالم" کی قابلیت کا اعتراف کیا۔ اور اسے مقابلہ کا انعام دے کر ہمت افزائی کی۔ اس طرح دنیا نے پہلی مرتبہ سنا۔ کہ روسو، فرانس میں ایک بڑا عالم ہے۔

حکومت اور کلیسا کا متحدہ فیصلہ

اب روسو پر شہرت کا دروازہ کھل گیا۔ بڑی تیز گامی سے آگے بڑھا۔ اور تھوڑے سے ہی عرصہ کے اندر اپنے عہد کا سب سے بڑا عالم تسلیم کر لیا گیا۔

مگر کیا اس شہرت و عزت سے اس کی زندگی کی مصائب دور ہو گئیں؟ نہیں

اور زیادہ ہوگئیں۔ پہلے وہ صرف تنگ دستی کا شکار تھا۔ اب وہ حکومت اور کلیسا کی دشمنی کا بھی شکار ہوگیا۔ جوں ہی اس کی تصانیف سوشل کنٹریکٹ، ہلواز اور امیل نامی شائع ہوئیں۔ حکومت اور کلیسا کے ایوانوں میں تہلکہ مچ گیا۔ دونوں نے بیک وقت اس پر یورش کر دی اور انتقام لینے کے لئے اپنے تمام ہتھیار سنبھال لئے!

مصائب و محن کا خاتمہ

امیل کے شائع ہوتے ہی ۹ جون ۱۷۶۲ء میں حکومت فرانس نے روسو کی گرفتاری کا فرمان جاری کر دیا۔ مجبوراً اسے فرار ہی میں سلامتی نظر آئی۔ فرانس سے بھاگ کر جنیوا پہنچا۔ مگر یہاں کی حکومت بھی اس کے لئے فرانس سے بہتر ثابت نہ ہوئی۔ اس نے بھی اس کی گرفتاری ضروری سمجھی۔ یہ حال دیکھ کر اس نے ہالینڈ کا رخ کیا۔ مگر ہالینڈ بھی ایک ایسے شخص کے استقبال کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے بھی وارورسن سے استقبال کرنا چاہا۔ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ اٹلی میں پناہ لے۔ وہ اٹلی پہنچا مگر اٹلی یورپ کا پایۂ تخت تھا۔ وہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی اس کے کفر و انکار پر گرفتاری و قتل کا فتویٰ صادر کر چکا تھا۔ بے بس ہو کر وہاں سے بھی نکلا اور انگلستان کے ایک گوشہ میں پناہ حاصل کر سکے گا۔ لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی بے رحم نکلا۔ اس کی مصیبت کا جام چھلک گیا تھا۔

اب یورپ میں اسے کہیں پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ جہاں چھپتا تھا۔ وہیں دشمن

کا ہاتھ دراز ہو جاتا تھا۔ ضاقت علیہم الارض بما رحبت و ضاقت علیہم انفسہم کے عالم میں مبتلا تھا۔ ابھی یہ مصیبت بڑھتی ہی جاتی تھی کہ ایک دوسری مصیبت بھی شروع ہو گئی یعنی طرح طرح کے جسمانی امراض و آلام نے آ گھیرا۔ آخر اسی حالت میں کہ دنیا اپنی ساری وسعت کے ساتھ اس پر تنگ ہو چکی تھی ۱۷۷۸ء میں انتقال کیا۔ اور گوشۂ قبر میں پناہ لی۔

ان مصائب نے روسو کے دل و دماغ پر کیا اثر ڈالا؟ کیا وہ ان سے مرعوب ہو گیا تھا؟ کیا اپنے عقائد و افکار سے دست بردار ہو گیا تھا؟ کیا اس نے اپنے بے پناہ دشمن کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے؟

اگر وہ ایسا کرتا تو یقیناً عیش کی زندگی بسر کرتا۔ مگر صرف زندگی ہی بسر کرتا، زندگی عظمت حاصل نہ کر سکتا۔ اپنی موت کے ساتھ ہی مر جاتا۔ اس کی ساری عظمت اس کی دماغی قابلیتوں سے زیادہ، اس کے دل کی مضبوطی میں ہے بلاشبہ وہ اپنا جسم کونے کونے میں چھپاتا پھرا۔ مگر اس کا قلم بے پناہ شمشیر بن کر ہمیشہ دشمن کا قلع قمع کرتا رہا۔ اس کی بلیغ ترین کتابیں۔ اسی آخری عہد مصائب کی یادگار ہیں،

ان میں سب سے بلند درجہ اس کے "مکالمات اور اعترافات" کو حاصل ہے ان سے بھی بڑھ کر اس کی وہ تحریریں ہیں، جو اس نے پیرس کے اسقف اعظم (لاٹ پادری) اور جینوا کی حکومت کے جواب میں لکھی تھیں۔

روسو اور کلیسا کا معرکہ

اس جنگ میں کون فتح مند رہا، روسو یا اس کے دشمن؟

اس کا جواب مدت ہوئی۔ خود زمانہ دے چکا ہے! زندگی میں اس کے لئے دنیا چار بالشت زمین کا گوشہ بھی مہیا نہ کر سکی لیکن اس کے مرنے کے بعد یورپ کا تمام بر اعظم اپنے ذہن و فکر کا صرف ایک ہی حکمران رکھتا تھا۔ اور وہ یہی معتوب عالم "روسو" تھا!

لیکن آج ہمیں روسو کی زندگی پر تبصرہ کرنا نہیں ہے۔

روسو کی زندگی پر تبصرہ، ضخیم کتابوں میں ہو سکتا ہے۔ آج ہم صرف اس کی فکری اور قلمی معرکہ آرائیوں میں سے ایک خاص معرکہ دکھانا چاہتے ہیں۔ یہی اس کے قلم کے معرکے ہیں۔ جو تھوڑے عرصے کے اندر انقلاب فرانس کے خونیں معرکوں کی شکل میں مبتدل ہو گئے۔ یہ معرکہ اس میں اور پیرس کے استقف کے درمیان واقع ہوا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ علم و عقل کے نئے ظہور اور مسیحی کلیسا کے قدیم جہل و جمود میں ہوا تھا۔ ہم اختصار پر مجبور ہیں۔

استقف کا بیان

استقف نے اپنا بیان اس افسوس کے ساتھ شروع کیا ہے۔ کہ فرانس میں کفر اور الحاد پھیلتا جاتا ہے۔ پھر یہ ثابت کیا ہے کہ یہ صورت حال، قرب قیامت کی علامت ہے، جیسا کہ پولس رسول نے پیشین گوئی کی ہے۔ پھر اس مقدس مگر ہولناک تمہید کے بعد وہ روسو پر پے درپے حملے شروع کر دیتا ہے۔

"یہی وہ الحاد ہے جسے ایک شخص (یعنی روسو) نے اپنی کتاب "امیل

میں پیش کیا ہے۔ اس شخص نے گناہ میں نشوونما پائی ہے۔ یہ ایک ایسی زبان بولتا ہے۔ جو فلاسفہ کی زبان ہے۔ مگر خود فلسفہ سے تہی دست ہے یہ ایک ایسا ذہن ہے۔ جس میں معلومات بے ترتیبی سے ٹھونس دیئے گئے ہیں۔ مگر وہ ہنوز تاریک ہے اور صرف اپنی تاریکی ہی پر قانع نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے دلوں میں بھی تاریکی اتار رہا ہے۔ یہ ایک ایسی طبیعت ہے جو عجیب وغریب افکار کی دلدادہ اور مجہول راستوں کی شیفتہ ہے۔ اس میں اخلاق کا افلاس اور فکر کی ثروت دونوں بیک وقت جمع ہو گئی ہیں۔ ایک طرف اسے متقدمین کے اصول سے شغف ہے۔ دوسری طرف عقلی بدعتوں کا جنون ہے۔ وہ خلوت پسند بھی ہے اور شہرت پسند بھی، علم کی محبت کا بھی دعوے رکھتا ہے۔ اور علم کی عداوت کا بھی علم اٹھائے ہے انجیل کے کمال کا بھی اعتراف کرتا ہے۔ اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ فضیلت کی ایسی تصویریں اتارتا ہے کہ بے اختیار تحسین وآفریں کا نعرہ بلند ہو جاتا ہے۔ مگر پھر فوراً ہی فسق وفجور کے پھاوڑوں سے اپنی بنائی ہوئی شاندار عمارت گرا بھی دیتا ہے۔ یہ نوع انسانی کا معلّم بن کر سامنے آیا ہے۔ مگر الحاد اور گمراہی کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔ یہ ضلالت کا امام ہے۔ فساد کا مرشد ہے۔ شیطان کا پیامبر ہے۔ تاریکی کا رہبر ہے۔ اور اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ وہ اپنی کتاب میں انسان کو حیوان کے درجہ میں رکھتا ہے۔ ایک اور رسالہ میں نفس پرستی کی تبلیغ کرتا ہے۔ پھر تربیت کی کتاب لکھتا ہے۔ مگر سراسر الحاد کی دعوت دیتا ہے!"

آگے چل کر، مصنف نے روسو کی کتاب "تربیت" پر اعتراض کئے ہیں۔ اور اس

پر زور دیا ہے کہ "دعوت الحاد" کی دعوت دی گئی ہے۔ وہ صرف یہ ہے۔ کہ وہ کہتا ہے، بچہ کی دماغی تربیت ایسی ہونی چاہیئے کہ وہ خود اس قابل ہو جائے۔ کہ دین حق کی معرفت پیدا کر سکے، اور اسے تقلید و رسوم کی بنا پر نہیں بلکہ فہم و بصیرت کے ساتھ منتخب کرے، ہمیں اس بات سے احتراز کرنا چاہیئے۔ کہ اسے کوئی ایسی جکڑ بندی کی تعلیم دیں۔ جس سے اس میں دماغی بصیرت اور مجتہدانہ فکر کی قوت پیدا نہ ہو سکے۔ اور دل و دماغ کسی جابرانہ تاثیر سے منفعل ہو جائیں ہمیں اس سے بھی احتراز کرنا چاہیئے۔ کہ اس کے دماغ میں کوئی ایسی بات اتاریں جسے وہ خود اپنی عقل سے معلوم نہیں کر سکتا۔"

اس پر اسقف نے اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے "ہمیں اس نظریہ پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا بچہ کو گمراہ ہو جانے کے لئے چھوڑ دینا چاہیئے؟ اگر ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ تو وہ سچا طریقہ کیا ہے؟ کتاب تربیت کا مولف بند بند لفظوں میں الحاد کی طرف دعوت دیتا ہے۔ لیکن ہم فطرت کے سچے طریقے یعنی مسیحیت کو پیش کرتے ہیں۔ در حقیقت دین مسیحی فطرتی دین ہے۔ فطرت ہمیشہ اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ عقل انسانی بجز انجیل کے راستہ کے کوئی دوسری راہ قبول ہی نہیں کر سکتی۔ یہ اس لئے کہ انجیل کا دین، فطرت اور عقل کا دین ہے"!

روسو اسقف کی تمام تشریحات برداشت کر سکتا تھا لیکن یقیناً اس بات کی برداشت اس کی طاقت سے باہر ہوگی۔ کہ "مسیحیت فطرت کی سچائی ہے" اور وہ "فطرت اور عقل کے دین کی طرف رہنمائی کرتی ہے" یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ پُرجوش

اسقف اور اس کے تمام ہم مشرب جس "مسیحیت اور انجیل" پر عامل تھے اور اس کی دعوت دے رہے تھے۔ وہ "کلیسا اور یورپ" کی "مسیحیت" تھی۔ نہ کہ مسیحیت کی پہلے عہد کی سادہ اور بے میل مسیحیت؛ امریکن مصنّف ڈریپر کے لفظوں میں "اٹھارھویں صدی کے تمام اجتماعی انقلابات غیر ضروری ہو جاتے اگر کلیسا اور یورپ کی نمائندگی کی جگہ مسیحیت اور مذہب کی کوئی دوسری نمائندگی وجود میں آ سکتی۔"

دراصل از منۂ وسطیٰ سے مسیحیت کا جو جہل پرور اور متبعد مزاج پیدا ہو گیا تھا اس کا قدرتی ردِ عمل والٹیر اور روسو کا انکار اور کفر تھا۔"

اس کے بعد اسقف کہتا ہے۔ "اگر دین مسیحی وہ سچا طریقہ ہے جس کے سوا فطرت انسانی کوئی دوسری راہ تصور ہی نہیں کر سکتی۔ تو پھر روسو کا دینی تعلیم و تربیت پر نکتہ چینی کرنا بجز اس کے کوئی معنی نہیں رکھتا کہ ہدایت سے ہٹا کر ضلالت کی طرف بلا رہا ہے!"

روسو نے کہا تھا " ہر بچہ جو اپنے بچپنے میں خدا پر ایمان رکھتا ہے ایک طرح کا بت پرست ہے۔ اور خدا کو انسان کی صورت میں یقین کرتا ہے۔ عقل انسانی اس عمر میں، خدا کا منزہ اور مطلق تصور کر ہی نہیں سکتی۔"

اسقف کا اس پر اعتراض یہ ہے۔ "اگر بچہ بت پرست ہوتا تو کئی خداؤں کا قائل ہوتا۔ اگر اس کے تفکر میں تجسّم ہوتا (یعنی خدا کو انسان کی صورت دیتا) تو پروردگار کا جسم بناتا۔ حالانکہ مسیحی بچوں کا کبھی ایسا اعتقاد نہیں ہوتا۔ وہ صحیح معنوں

میں موجود ہوتے ہیں۔ مؤلف (روسو) نے یہ کہہ کر دراصل مسیحیت کو بت پرستی قرار دیا ہے۔

روسو نے لکھا تھا: "میں جانتا ہوں کہ نظام عالم کو ایک قادر و حکیم ارادہ چلا رہا ہے۔ میں یہ دیکھتا یا محسوس کرتا ہوں اور اس کی معرفت میری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہ عالم کب سے اور کس طرح ہے؟ اشیاء کی اصل ایک ہے۔ یا متعدد ہیں؟ ان کی طبیعت کیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ اور نہ مجھے جاننے کی ضرورت ہے .... یہی باعث ہے کہ میں یہ حقیر مسائل نظر انداز کر جاتا ہوں۔ ممکن ہے یہ میری عقل کو مشغول کر لیں۔ مگر مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے پھر یہ مسائل میری عقل سے بالاتر بھی ہیں ....."

اس پر اسقف اعتراض کرتا ہے۔ "بے باک مصنف کا اس قول سے کیا مقصود ہے؟ وہ جانتا ہے کہ کائنات کا نظام ایک قادر و حکیم ارادہ کے ماتحت ہے۔ وہ اعتراف کرتا ہے کہ اس حقیقت کا علم اس کے لئے ضروری ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہتا ہے 'نہیں معلوم، اشیا کی اصل ایک ہے۔ یا ایک سے زیادہ ہے'؟ پھر دعوے کرتا ہے کہ مجھے اس نقطہ کے معلوم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مصنف دراصل خدا کی وحدانیت پر شک رکھتا ہے۔ اس علم کے بعد کہ کائنات ایک قادر و حکیم ارادہ کے تصرف و اختیار میں ہے۔ کیا یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اشیاء کی اصل ایک ہے۔ یا کئی ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ پہلی حقیقت کا علم ضروری ہو، اور دوسری کی معرفت غیر ضروری قرار پائے؟ کیا یہ صریح تناقض اور الحاد

نہیں ہے؟ وہ کہتا ہے میں خدا کی طبیعت و حقیقت سے باخبر ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ دعوےٰ بھی کرتا ہے۔ کہ یہ موجودہ حقیقی، علم، قدرت، ارادہ، اور حکومت رکھتا ہے! اس سے تو معلوم ہوا کہ وحدانیت اس کے خیال میں ایک "حقیر سا مسئلہ" ہے اور کسی طرح بھی اس کی عقل میں نہیں آ سکتا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ متعدد خداؤں کا تصور اس کی عقل کے نزدیک معقول ہے۔ بھلا اس حماقت سے بڑھ کر بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے؟"

دوسرا معجزات کو اس معنی میں تسلیم نہیں کرتا کہ وہ خارق عادت ہیں۔ معجزات پر گفتگو کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے یا للعجب! ہمیشہ آدمیوں ہی کی گواہیاں! آدمی، اپنے ہی جیسے آدمیوں سے سنتے ہیں۔ اور دوسرے آدمیوں کو سناتے ہیں! میرے اور خدا کے درمیان آدمیوں کے کتنے ان گنت واسطے قائم ہو گئے ہیں!"

اس پر اسقف لکھتا ہے۔ اگر آدمیوں کی گواہی معتبر نہیں ہے تو پھر ہم پوچھتے ہیں۔ مؤلف نے اسپارٹا، ایتھنز، اور روم کو کیونکر جانا، جن کی عظمت کا وہ ہمیشہ راگ گایا کرتا ہے؟ ان قدیم جمہوریتوں اور مؤلف کے مابین آدمیوں کے کتنے بہت سے واسطے موجود ہیں؟ وہ ان واسطوں پر شک نہیں کرتا۔ لیکن مسیحی معجزات کی روایت میں وہ کوئی واسطہ منظور کرنا نہیں چاہتا۔ دراصل اس کے اعتراض کی اصلی علت "الحاد" ہے۔ وہ خدا ہی کو نہیں مانتا!"

اسقف کا بیان بہت طویل ہے۔ اس مضمون میں اس کا پورا خلاصہ بھی ممکن

نہیں۔ لیکن اس کا آخری اعتراض ضرور نقل کر دینا چاہیئے۔ روسو نے بادشاہوں کے وجود پر سختی سے حملہ کیا ہے۔ اسقف اس کے جواب میں لکھتا ہے۔

یہ بھی مولف کا الحاد ہی ہے جس سے متاثر ہو کر وہ بادشاہوں کے وجود پر نکتہ چینی کرتا ہے۔ بادشاہوں کو برباد کر کے وہ ایسے قواعد جاری کرنا چاہتا ہے جن کا نتیجہ بجز بدامنی اور طوائف الملکی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ مصنف کے مذہب اور دین حق میں کتنا تضاد ہے؟ مصنف بد اخلاقی اور بدامنی کی تعلیم دیتا ہے لیکن دین حق خشیت الٰہی اور بادشاہ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے۔ دین کا حکم یہ ہے۔ کہ ہر آدمی اپنے آقا کی فرمانبرداری کرے۔ دین کہتا ہے بادشاہی خدا کی قوت ہے۔ اس کا پاک سایہ ہے۔ اور اسی نے زمین پر نازل کی ہے۔ جو اس کا مخالف ہے۔ وہ خود خدا کا باغی ہے۔ اس پر خدا کی ابدی لعنت ہو۔"

اس طرح اسقف نے اپنا رسالہ قرب قیامت کی ہولناکی سے شروع کر کے "ابدی لعنت" کی پیش کش پر ختم کر دیا ہے!

یہ روسو کے سب سے بڑے کلیسائی مناظر کا حملہ تھا۔ اب دیکھنا چاہیئے روسو نے اس کا دفاع کیونکر کیا ہے؟ روسو کے سخت سے سخت نکتہ چین بھی تسلیم کرتے ہیں۔ کہ اس کا جواب مناظرانہ قوت بیانیہ کا بے نظیر ثبوت تھا۔

اسقف کا جواب

معذرت

روسو نے اپنا جواب معذرت سے شروع کیا ہے

"اگر آپ صرف میری کتاب پر اعتراض کرتے تو میں ہرگز آپ سے کوئی تعرض نہ کرتا۔ آپ کو چھوڑ دیتا کہ جتنی چاہیں نکتہ چینی کرتے رہیں۔ لیکن آپ نے صرف کتاب پر ہی نہیں بلکہ میری ذات پر بھی بحث کی ہے۔ آپ کو دنیا میں جتنی عزت اور قوت حاصل ہے۔ اسی مناسبت سے آپ میں یہ بات بھی ہونی چاہیئے تھی، کہ ان تہمتوں سے بلند تر ہوتے جن سے آپ نے مجھے آلودہ کرنا چاہا ہے۔"

داستانِ مظلومی

اس کے بعد روسو نہایت بلاغت و مہارت سے اپنے قارئین کی ہمدردی حاصل کرنی چاہتا ہے وہ اپنی مسکینی و مظلومی ظاہر کرتا ہے۔ تمام یورپ کا اس کے خلاف متحد ہو جانا اور عرصہ زمین تنگ کر دینا یاد دلاتا ہے پھر لکھتا ہے۔

"جینیوا کے غلام، روسو کے ہاتھ میں کوئی قوت نہیں، کہ ان ظالم اور سرکش ججوں سے جواب طلب کر سکے۔ جن کے سامنے اس پر تہمت لگائی گئی۔ اور

جنہوں نے اسے طلب کئے بغیر اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اسے قید کرنے کے بھی درپے ہو گئے ہیں۔ "یہ غلام" اگر عدالت میں طلب کیا جاتا تو اپنی برأت ظاہر کرنے ضرور حاضر ہوتا۔ مگر چونکہ اسے بلایا نہیں گیا اس لئے اسے از خود حاضر ہونے کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چنانچہ وہ حاضر نہیں ہوا۔ اس پر اس کے خلاف جنگی قوت جمع کی گئی۔۔ اس نے قوت کے مقابلہ سے گریز کیا۔ اور اس سرزمین سے بھاگ نکلا۔ جہاں کمزوروں پر ظلم کیا جاتا ہے۔ بغیر جرم کے سزا دے دی جاتی ہے۔ اور بغیر حساب سنے بیڑیاں پہنا دی جاتی ہیں"

اس نے مجبوراً" اپنا محبوب خلوت خانہ چھوڑا۔ ان دوستوں کی جدائی سہی۔ جن سے بڑھ کر اس کے لئے کوئی عیش نہ تھا۔ اپنا ناتواں جسم لے کر ہزاروں امیدوں کے ساتھ سرزمین حریت میں پہنچا۔ آہ میرا وطن مینھا! میں نے تیری آزادی کے کیسے کیسے گیت گائے؟ تیرے حسن و جمال کی کیسی کیسی تصویریں بنائیں دنیا میں تیرا نام کس درجہ روشن کیا؟ آہ میں کیا کہوں! میرا دل سینے میں بیٹھا جاتا ہے۔ میرا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ میرا قلم گرا پڑتا ہے۔۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے خاموش رہنا چاہیئے۔ مجھے جرم کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیئے۔۔۔۔۔۔۔ کاش میں خفیہ طور پر ہی اپنی ناقابل برداشت مصائب کہہ سکتا! کاش میں اپنی دل کی گہرائی ہی میں اپنے وطن کی شکایت کا خیال کر سکتا!۔۔۔۔"

یہ سب کچھ کیوں ہے؟ میں اس کا حقیقی سبب نہیں پوچھتا۔ میں صرف اس کا ظاہری موجب معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر الحاد کی تہمت لگانے کی

جرأت کی گئی ہے۔ مگر تہمت لگانے والے بالکل بھول گئے۔ کہ جس کتاب پر انہیں اعتراض ہے۔ وہ سب کے ہاتھوں میں موجود اور سب کی آنکھوں کے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ مجھ پر تہمت لگانے والے افسوس سے ہاتھ ملتے ہیں کاش یہ کتاب کسی طرح مفقود ہو جائے تاکہ ہم پیٹ بھر کے تہمیں تراشش کر سکیں !" لیکن ان کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہو گی۔ کتاب ان کی حسرت کے لیئے ہمیشہ باقی رہے گی۔ اور آئندہ آنے والی نسلیں فیصلہ کریں گی۔ وہ اعلان کریں گی۔ کہ یہ تمام گناہ اس کے مؤلف کی بدعملیاں نہیں ہیں۔ لیکن فضیلت کے ایک دوست کی ٹھوکریں ہیں !"

ایک ملحد کا ذکر

میں معاصرین پر اظہار رائے نہیں کروں گا۔ میں کسی کو بھی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ لیکن کیا تم نے سپنوزا کا نام نہیں سنا؟ اس کے الحاد میں کسے شک ہو سکتا ہے ؟ وہ خود الحاد کا مدعی تھا۔ علانیہ الحاد کی تعلیم دیتا تھا مگر نہ کوئی اس کے اطمینان میں خلل ڈالتا تھا۔ نہ اس کی کتابیں چھپنے سے روکی جاتی تھیں۔ اور نہ ہی تاجروں کو ان کی اشاعت کی ممانعت کی گئی۔ وہ فرانس آیا تو اس کے لیئے ایک پرجلال استقبال تیار تھا۔ تمام ملکوں کے دروازے اس پر کھلے تھے وہ ہر جگہ امن کی بلکہ حکومتوں کی حمایت پاتا تھا۔ بادشاہ ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ اور وعظ و درس کے ممبر اس کے لئے نصب کراتے تھے۔ یہ ملحد زندگی بھر

مسرت و آرام بلکہ عزت و احترام پاتا رہا۔

عہدِ حکومت و انسانیت

لیکن آج جب کہ ببانگ دھل دعوے کیا جاتا ہے کہ یہ فلسفہ و حکمت اور انسانیت کا زمانہ ہے ۔؟ دنیا کا حال کیا ہے؟ یہ ہے کہ ایک شخص انسانی جذبے سے مجبور ہو کر آتا ہے۔ اور پوری احتیاط و احترام سے اپنے بعض خیالات پیش کرتا ہے۔ کیسے خیالات ؟ وہ خیالات جو اُس موجود اعظم کی عظمت نے اس کے دماغ پر نازل کئے ہیں۔ لیکن دین الٰہی و حقیقت کے اس حامی و ناصر کی زندگی تلخ کر دی جاتی ہے۔ یورپ بھر میں اسے کہیں پناہ نہیں ملتی۔ اسے خدا کا پیدا کیا ہوا پانی پینے سے اور اس کے اگائے ہوئے درختوں کی لکڑی جلانے سے بھی روک دیا جاتا ہے وہ ذلیل و خوار پھرتا ہے جس گوشہ میں جا کر پناہ ڈھونڈتا ہے وہیں سے نکال دیا جاتا ہے۔ نہ اس کی غربت پر کسی کو ترس آتا ہے اور نہ اس کی بیماریوں پر کسی کا دل کڑھتا ہے۔ شریر سے شریر مجرموں اور خونی سے خونی ڈاکوؤں کا بھی اس بے دردی سے تعاقب نہیں کیا ہوگا۔ جیسا اس بیکس و مظلوم کا کیا گیا ہے اگر وہ ایک لحہ بھی کسی حکومت کے رحم پر بھروسہ کر لیتا۔ تو آج یقیناً تاریک قید خانے میں پڑا سڑ رہا ہوتا۔ یا پھانسی کے تختے پر اس کی لاش سوکھ رہی ہوتی۔"

پادریوں کا پنجہ

مرمر کے اس نے جلادوں کے پنجہ سے رہائی حاصل کی تھی مگر ہائے بد نصیبی

فوراً تسیسوں کے خیگل نے ا سے آدبوچا! میں یہ اس لیے نہیں کہتا کہ مجھے اس پر کوئی تعجب ہے۔ لیکن بلاشبہ یہ عجیب ہے کہ ایسا شریف و نجیف اللسان اور پیرس کا اسقف اعظم جو صرف شریف النسب ہی نہیں بلکہ شریف النفس بھی ہے۔ کیونکر اپنی جماعت کی بزدلی میں شریک ہو گیا۔ حالانکہ اسے ایسی دناءت سے بلند ہونا چاہیئے تھا۔ ایک مذہبی پیشوا ہونے کی حیثیت سے اس کا فرض تھا۔ کہ مظلوم پر ترس کھائے۔ نہ یہ کہ الٹا مظلوم کے کچلنے پر کمر بستہ ہو جاتے۔ وہ مظلوم جو پہلے ہی سے زمانے کے ہاتھوں کچلا جا چکا ہے۔"

اس اسقف اعظم کے تمام حاشیہ بردار اس ناکردہ گناہ کے مٹا ڈالنے پر تل گئے ہیں۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ ہم اسے ضرور بالضرور مٹا دیں گے۔ حقیر سے حقیر واعظ اور راہبی سے ادنیٰ اخبار بھی کوشش کر رہا ہے۔ کہ اس خود ساختہ دشمن کے گلا گھونٹنے کا فخر صرف اسی کو حاصل ہو اور اس کے سر پہ فیصلہ کن ضرب اسی کے پاؤں کی ٹھوکر سے لگے۔"

اسقف نے کیوں فتویٰ شائع کیا

اے میرے سردار! کون شک کر سکتا ہے کہ اگر پیرس کی مجلس حکومت نے میرے خلاف حکم صادر نہ کیا ہوتا۔ تو آپ کو میری کتاب سے بغض کم ہوتا؟ بلاشبہ بعض لوگ یہی خیال ظاہر کرتے ہیں۔ مگر آپ کا حق پسند دل اسے ہرگز تسلیم نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ خلاف واقعہ ہے اے میرے آقا! مجھے بتائیے آپ

نے اب سے پہلے میرا رد کرنے کی زحمت کیوں گوارا نہیں کی؟ میں نے آپ کے منصب کے خلاف رسالہ شائع کیا۔ میں نے دی لامبرٹ کے نام خطوط چھاپے کئی کتابیں لکھیں۔ مگر آپ کے قلم کو کبھی جنبش نہ ہوئی۔ حالانکہ میری ان کتابوں میں ویسے ہی خیالات موجود تھے۔ جیسے کتاب "التربیت" میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ کیا آپ نے میری یہ کتابیں نہیں پڑھی تھیں؟ حالانکہ پہلے نہ پڑھی ہوں تو اپنے اس رد میں ان پر بحث نہ کر سکتے۔ کیا آپ کی یہ خاموشی آپ کے دینی فرائض کے خلاف نہ تھی؟ حالانکہ بقول آپ کے ان کتابوں میں بھی الحاد کی دعوت دی گئی ہے۔ کیا یہ حقیر مؤلف اس وقت کم خطاکار تھا۔ اور اب زیادہ ہو گیا ہے؟ حالانکہ آپ اسے پیدائشی خطاکار قرار دیتے ہیں۔ آخر کیا بات تھی جو اتنی مدت تک زبان مبارک نہ ہلی؟ یہ وجہ تو نہ تھی کہ اس وقت آپ کے دشمن کم تھے۔ اور میں بھی خائنوں سے گھرا ہوا تھا؟ اس وقت عوام میں میری کتابیں مقبول ہو چکی تھیں۔ اور آپ عوام کے غصے سے ڈرتے تھے لیکن اب جب کہ حالات میں تبدیلی پیدا ہوئی۔ میرے دشمنوں نے ایکا کر کے مجھ پر یورش کر دی۔ مجھے ملحد اور باغی مشہور کیا۔ حکومت نے بھی ہتھیار سنبھال لئے اور آپ کے دشمنوں نے بھی کہنا شروع کیا کہ پیشوائے اعظم ہو کر آپ اس ملحد کے خلاف کچھ نہیں کہتے۔ گویا اپنی خاموشی سے اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ تو آپ اپنے منصب کی حفاظت کے خیال سے اٹھے۔ اور اپنے دشمنوں کا منہ بند کرنے کے لئے میرے خلاف فتویٰ شائع کر دیا۔ اگر ایسا ہی ہے تو بلاشبہ میرے دماغ کو شدت تحیر سے سکتہ ہو جانا چاہیئے!

اس تمہید کے بعد روسو، اسقف کے بیان کا رد شروع کرتا ہے۔

صفاتِ الٰہی

اسقف نے لکھا تھا۔

"روسو کہتا ہے۔ میں خدا کی حقیقت سے بے خبر ہوں۔ لیکن ساتھ ہی دعوے بھی کرتا ہے۔ کہ موجود حقیقی علم، قدرت، ارادہ اور حکمت رکھتا ہے۔"

"روسو جواب دیتا ہے۔" خدا کی صفت علم ہے۔ لیکن اس کا علم اقدس کسی تفکر و تامل کا محتاج نہیں۔ اس کی تفکیر کے لئے نہ تو مقدمات ہیں۔ نہ نتائج ہیں۔ نہ فرض و قیاسات ہیں۔ اس کا علم ازلی ہے۔ جو تھا۔ جو ہے۔ جو ہوگا۔ سب اس پر آشکارا ہے۔ تمام حقائق اس کے سامنے ذرۂ ریگ سے بھی چھوٹے ہیں۔ تمام دنیا اس کی نظر میں قطرۂ آب سے بھی محدود ہے۔ تمام اگلے پچھلے زمانے اس کے نزدیک لمحہ بصر سے بھی مختصر ہیں۔"

"باقی رہی قدرت الٰہی، تو قدرت الٰہی کا یہ حال ہے۔ کہ انسان کو اپنی قوت عمل کے لئے وسائل عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خدا کو کسی وسیلے کی ضرورت نہیں قوت الٰہی خود اپنی قوت سے عمل کرتی ہے۔ خدا قادر ہے۔ کیونکہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور اس کا ارادہ ہی اس کی قدرت ہے!"

"خدا، لاریب خیر ہے۔ انسان کا خیر یہ ہے کہ اپنے بنی نوع سے محبت کرے۔ لیکن خدا کا خیر اس کا وہ نظام ہے۔ جس سے وہ کائنات کو سنبھالے اور تمام

اجزا کو باہم جوڑے ہوئے ہے۔"

"خدا لاریب عادل ہے۔ عدل الٰہی بھی اس کے خیر ہی کا ایک نتیجہ ہے۔ انسان کا ظلم خود انسان کا اپنا عمل ہے۔ خدا کا عمل نہیں ہے۔ روح کا اضطراب جس کی وجہ سے فلاسفہ قدرت الٰہی کے منکر ہو جاتے ہیں میری نظر میں اس لا متناہی قدرت کو اور زیادہ واضح کرنے والا ہے۔ انسان کا عدل یہ ہے۔ کہ ہر حقدار کو اس کا حق دے دے خدا کا عدل یہ ہے کہ ہر ایک سے اپنی نعمتوں اور بخششوں کا حساب لے۔"

حقیقتِ الٰہی

یہ صفات میں نے عقل کی منطق کی راہ سے معلوم کر لی ہیں۔ لیکن میرے دماغ میں ان کا مفہوم مرتب و مفصل نہیں ہے۔ میں انہیں تسلیم کرتا۔ اور ان پہ اصرار کرتا ہوں گمان کی پوری حقیقت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ عقل اس کا احاطہ کر ہی نہیں سکتی۔ اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ میں حقیقت سے لاعلم ہوں۔ اور اس لئے میری حیثیت یہ نہیں ہے۔ کہ میں جانتا ہوں اور اصرار کرتا ہوں۔ میں اپنے دل سے بے فائدہ کہتا ہوں "یہی خدا ہے۔" میں بے فائدہ اس کا شعور کرنا چاہتا ہوں میں بے فائدہ اپنے ذہن میں اس کا تصور کرتا ہوں۔ "بے فائدہ" اس لئے کہ اس سے خدا کی حقیقت پر ذرا بھی روشنی نہیں پڑتی۔ میں ہرگز معلوم نہیں کر سکتا۔ خدا ایسا کیوں ہے؟ اس میں یہ صفات کیونکر قائم و موجود ہیں؟

میں اس کی حقیقت جاننے کی جتنی زیادہ کوشش کرتا ہوں۔ اتنی ہی اس کی

حقیقت پوشیدہ ہوتی جاتی ہے۔ میری یہ عقل کی بے بسی مجھ میں اس کا اعتقاد ایمان اور بھی زیادہ مستحکم کر دیتی ہے۔ میں جس قدر اس کا تصور کم کر سکتا ہوں۔ اسی قدر اس سے زیادہ وابستہ ہوتا اور اتنا ہی اس کی عبادت پر جھکتا جاتا ہوں۔ تو اتنا ہی زیادہ میرا نفس بلند کرتا جاتا ہے مگر تیری حقیقت برابر مجھ سے مستور ہی رہتی ہے۔ یا تجھ میں میرا فنا ہو جانا۔ میری عقل کا سب سے بڑا کارنامہ ہے! تیری عظمت نے میری عقل مبہوت کر دی ہے۔ مگر میری ناتوانی کو بھی قوت سے بدل دیا ہے!"

وحدانیت یا تعدد؟

اسقف نے لکھا تھا ..... "وحدانیت اس کے (روسو) خیال میں ایک حقیر مسئلہ ہے۔ اور کسی طرح بھی اس کی عقل میں نہیں آ سکتا۔ لیکن متعدد خداؤں کا تصور اس کی عقل کے نزدیک معقول ہے ....."

روسو جواب دیتا ہے۔

متعدد خداؤں کا کس نے ذکر کیا؟ اے میرے آقا اسقف! تجھ پر میرا صبر پڑے! میں نے یہ کب کہا؟ بے شک تمہاری دلی آرزو یہی ہوگی کہ میں اس درجہ احمق ہوتا تو تمہیں میرے "عالمانہ رد" لکھنے کا فخر بھی حاصل نہ ہوتا!"

"بلا شبہ میں نہیں جانتا۔ کائنات کیوں بنی ہے۔ اور کیونکر بنی ہے! میرے سوا جو لوگ معرفت کے مدعی ہیں۔ وہ بھی اس بات میں مجھ سے زیادہ علم نہیں رکھتے لیکن میں صاف دیکھتا ہوں۔ کہ تمام حرکت کا محرک ایک ہی وجود ہے۔ تمام کائنات

ایک ہی رخ رکھتی ہے۔ اور ایک ہی قسم کے مقاصد پورے کر رہی ہے یہ اس حقیقت کی روشن دلیل ہے کہ کوئی ایک بلند تر ارادہ کارفرما ہے اور کوئی ایک ہی بالاتر قوت عمل پیرا ہے۔ ارادے اور اس قوت کو میں ایک ہی ذات سے منسوب کرتا ہوں کیونکہ وہ دونوں باہم متفق ہیں اور ان دونوں کو ایک ہی ذات کا خاصہ سمجھنا، دو ذاتوں کی طرف منسوب کرنے سے زیادہ معقول ہے۔ تعدد، صرف اسی وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جب اس کا کوئی ثبوت موجود ہو۔ لیکن کائنات میں کوئی اس قسم کا ثبوت موجود نہیں۔ یہ خیال سراسر وہم ہے کہ خیر کا خالق اور شر کا خالق ایک نہیں ہو سکتا۔ جس چیز کو ہم شر سمجھتے ہیں۔ وہ علی الاطلاق شر ہے ہی نہیں۔ شر مطلق سے مجھے انکار ہے۔ یہ اعتباری شر بھی خیر سے برسرِ پیکار نہیں ہے۔ بلکہ نظام عالم کی تکمیل میں خیر کا ممد و معاون ہے"

روسو کا عقیدہ

اس کے بعد روسو اپنی کتاب اور اپنے شخصی عقیدے کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔

اب میں وہ سب بیان کرتا ہوں۔ جس نے مجھے یہ کتاب شائع کرنے پر مجبور کیا۔ اس تمام شور و غوغا کے باوجود بھی میں اس کتاب کو اپنے عہد کی بہترین کتاب یقین کرتا ہوں۔ آگ کے شعلے، حکومتوں کے فیصلے، مذہبی پیشواؤں کے فتوے مجھے ہرگز مرعوب نہیں کر سکتے۔ وہ میرے لب و لہجہ میں ہرگز کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر

سکتے نہ تولا ہوتی، ایمان کی ریاکارانہ تلقین کر کے مجھے جھوٹا بنا سکتے ہیں۔ نہ خلا سفر مجھے منافقت کا طعنہ دے کر الحاد پر آمادہ کر سکتے ہیں۔ میں برابر اپنے دین کا اعلان کروں گا۔ کیونکہ میں دین رکھتا ہوں۔ میں ببانگ دہل اسے شہرت دوں گا۔ کیونکہ مجھ میں اعلان و اشتہار کی شجاعت موجود ہے۔ آہ! میں نے کتنی تمنائیں کیں کہ سب لوگوں میں اتنی ہی شجاعت ہوتی ! اگر سب میں اتنی شجاعت ہوتی تو انسانیت کو کتنا نفع پہنچتا؟

حضرتِ مسیح کا شاگرد

اے میرے آقا! میں مسیحی ہوں۔ میں اخلاص کے ساتھ انجیلی مذہب کا مسیحی ہوں۔ ہاں میں مسیحی ہوں۔ لیکن پادریوں کا شاگرد نہیں ہوں۔ بلکہ خود مسیح علیہ السلام کا شاگرد ہوں۔ میرا استاد کتابوں کی عبارتوں پر بحث نہیں کرتا تھا لیکن عمل پہ نظر رکھتا اور عمل ہی پہ زور دیتا تھا۔ اس نے ہمیں جس ایمان کی تلقین کی ہے، اس کے قواعد و اصول بہت زیادہ اور پیچ در پیچ نہیں ہیں۔ صرف گنتی کی چند موٹی موٹی باتیں ہیں۔ لیکن اس نے جس نیکی کی تعلیم دی ہے۔ اس کی شاخیں بے شمار ادر راہیں بے حساب ہیں۔ اس نے ہمارے ایمان میں موشگافیاں نہیں کی ہیں۔ لیکن عمل صالح کی پورے شرح و بسط سے تفسیر کی ہے۔ اس نے ایمان کے لئے صرف دو موٹی موٹی باتیں ضروری ٹھہرائی ہیں۔ لیکن عمل کی نیکی کے لئے کوئی گنتی نہیں بتائی ہے۔ کیونکہ عملی نیکیاں ان گنت ہیں۔ اس نے جہاں کہیں انبیاء کے

نمونوں پر زور دیا ہے۔ وہاں ایمان سے زیادہ ان کے اعمال بتاتے ہیں اس نے اپنی اور تمام نبیوں کی تعلیم کا لب لباب اس ایک جملہ میں بیان کر دیا۔
"اپنے بھائی سے محبت کرنا، پرماتما پر یقین ہے۔"

دوستوں اور دشمنوں کو دعوت

اس کے بعد لکھتا ہے۔

مجھے ہمیشہ خلوت کی پرمسرت زندگی حاصل نہیں رہی۔ لوگوں سے ملنے جلنے پر بھی مجبور ہونا رہا ہوں۔ میری ہر طبقہ کے لوگوں سے ملاقات ہے۔ میں نے مختلف سیاسی اور دینی جماعتوں کے لوگ دیکھے ہیں۔ میں مومنوں سے بھی ملا ہوں اور ملحدوں سے بھی۔ میں نے حکماء بھی دیکھے ہیں۔ جہلاء بھی، متعصب بھی دیکھے ہیں غیر متعصب بھی سنجیدہ بھی میری صحبت میں بیٹھے ہیں اور مسخرے بھی، میرے دوست بھی بہت ہیں اور دشمن بھی۔ میں دنیا میں تمام آدمیوں کو، جنھوں نے مجھے کبھی دیکھا یا جانا ہے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کر پکارتا اور دعوت دیتا ہوں کہ وہ سامنے آئیں اور میرے عقیدے کی بابت جو کچھ جانتے ہوں، برملا کہہ ڈالیں! وہ جرأت سے بڑھیں اور بتائیں، کبھی کسی حال میں بھی انھوں نے میرے عقیدے میں کوئی تبدیلی دیکھی یا محسوس کی؟ قہوہ خانے کی صحبتوں، کھانے کی میز کی نشستوں، بے تکلفی کی ملاقاتوں سنجیدہ یا مذاق کی گفتگوؤں، غرضکہ کبھی کسی موقع پر بھی انھوں نے میری زبان سے کوئی ایسا لفظ سنا، جو اس سے مختلف تھا جس کا میں اپنی کتابوں میں اعلان و اشتہار

کرتا رہا ہوں ؟ وہ صاف صاف کہیں: ان کی دلیلیں، ان کی نکتہ چینیاں، ان کا تمسخر، کبھی میرے عقیدے میں کوئی تزلزل پیدا کر سکا ہے؟ وہ بتائیں، کبھی ایک لمحہ کے لئے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ میں کوئی ایسا عقیدہ یا خیال رکھتا ہوں جو علی الاعلان دنیا کے سامنے ظاہر نہیں کرتا؟ ہاں میں اپنے تمام دوستوں اور تمام دشمنوں کو ایک ساتھ دعوت دیتا ہوں۔ دوستوں کو دوستی کا واسطہ دیتا ہوں۔ دشمنوں کو دشمنی کی قسم دیتا ہوں۔ بے رو و رعایت۔ بے خوف و خطر، مردانہ وار میدان میں آئیں اور جو کچھ بھی کہہ سکتے ہوں بے کھٹکے کہہ ڈالیں! میں اپنے دوستوں اور دشمنوں، دونوں کی شرافت و دیانت پر بغیر کسی پس و پیش کے بھروسہ کرتا ہوں میں اپنی پوری شرافت ان کے سامنے رکھے دیتا ہوں۔ میں ہرگز کسی سے بحث اور حجت نہیں کروں گا۔ جو کچھ بھی وہ کہہ دیں گے۔ بے چون و چرا تسلیم کر لوں گا۔"

انبیاء کرامؑ کی عظمت

میں ان تمام انسانوں کی عزت کرتا ہوں۔ جنہوں نے مذاہب و ادیان قائم کئے ہیں۔ وہ سب عظیم کار [illegible] علی فضائل کے مالک تھے۔ ان کی عظمت و فضیلت ہمیشہ محترم و مسلم رہے گی۔ سب کا دعوے تھا کہ خدا کے پیغام بر ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ الاہیات میں مسلسل تفکر اور فضائل کا غیر مفید عشق انسانی روح کو کسی حد تک پہنچا سکتا ہے؟ منطق کو کیا حق ہے کہ مداخلت کر کے یہ معاملہ امتیاز سطح پر لے آتے۔؟ غیر تناہی بلندی پر پہنچانے کے بعد ہمارا سر

چکرا جاتا ہے اور ہماری نظریں اشیاء کو ان کی حقیقی شکل میں دیکھنے سے قاصر ہو جاتی ہیں"

معجزات

معجزات پر روسو نے لکھا تھا "یا للعجب! ہمیشہ آدمیوں ہی کی گواہیاں آدمی اپنے ہی جیسے آدمیوں سے سنتے ہیں۔ اور دوسرے آدمیوں کو سناتے ہیں! میرے اور خدا کے درمیان آدمیوں کے کتنے ان گنت واسطے قائم ہو گئے ہیں۔؟

اس پر ایک مصنف نے اعتراض کیا تھا" اگر آدمیوں کی گواہی معتبر نہیں تو ہم پوچھتے ہیں۔ مؤلف نے اسپارٹا، ایتھنز اور روم کو کیونکر جانا...؟"

روسو جواب دیتا ہے۔

"اگر معاملہ اس درجہ اہم نہ ہوتا یا میں اے آقا۔ آپ کا اس درجہ احترام نہ کرتا ہوتا تو آپ دیکھتے آپ کے اس طریق استدلال نے میرے لئے اپنے ناظرین کو ہنسانے کی کیسی عمدہ فرصت مہیا کر دی تھی۔ لیکن حاشا و کلا! میں ہرگز اس لہجہ سے دست بردار نہیں ہوں گا۔ جو اس موضوع بحث کے لئے ضروری ہے اور اس شخص کے مرتبہ کے لائق ہے۔ جس سے تخاطب کی عزت حاصل کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔ میرے لئے اس قدر کافی ہے کہ آپ کی غلطی ظاہر کر دوں۔"

میں نہایت عاجزی سے جناب والا کو یاد دلاتا ہوں۔ بے شک یہ بالکل

معقول ہے کہ انسانی معاملات انسانی شہادتوں سے طے کیے جائیں۔ کیونکہ ان کے ثابت ہونے کا اس کے سوا کوئی طریقہ موجود نہیں بلاشبہ میں نے اسپارٹا اور ایتھنز کو آدمیوں ہی کی شہادت سے جانا۔ لیکن میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ میرے اور خدا کے درمیان ان واسطوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا ضرور ہے کہ یہ واسطے مجھ سے اتنے دور ہوں۔ کہ خود ان کے جاننے کے لئے مجھے اور بہت سے انسانی واسطے تلاش کرنے پڑیں؟ یا یہ معقول ہے کہ خدا جان جاک روسو سے گفتگو کرنے کے لئے ہمیشہ ایک موسٰے علیہ السلام کو ڈھونڈھتا پھرے"

پھر یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ اسپارٹا پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے اگر کوئی اس پر ایمان نہ لائے تو لعنت کا مستحق نہیں ہو جائے گا۔ اسپارٹا کے وجود پر شک کرنے کی وجہ سے ہرگز کوئی دوزخ کا کندا نہیں بن جاسکتا۔ لیکن اگر ایک شخص دینی تعلیمات کی تصدیق نہیں کرے گا۔ تو اس کے لئے ابدی عذاب ہے جس بات کے نہ ماننے کی اتنی بڑی سزا ہو۔ ضروری ہے کہ اس کے ماننے کے ذرائع و دلائل بھی اس مناسبت سے قطعی اور واضح ہوں۔"

کوئی بات بھی جو ہماری چشم دید نہیں ہے بغیر معقول دلیل کے ثابت نہیں ہو سکتی اور ہر بڑی سے بڑی روایت بھی صدق و کذب کی متحمل ہے۔"

" اگر معجزات خود میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوتے۔ جب بھی میں اس غیر معقول طریق ایمان سے انکار کر دیتا۔ سحر کی تصدیق میرے لئے اس سے کہیں آسان ہے کہ خدا کے کلمہ کی غیر معقول طریقہ پر تصدیق کر دوں۔"

موجودہ مسیحیّت

اس کے بعد وہ موجودہ مسیحی دین پر اظہارِ خیال کرتا ہے

استقفوں اور پادریوں نے مسیحیت کو اس کی اصلی روح سے محروم کر دیا ہے۔ اب یہ سوال نہیں کیا جاتا کہ ایک مومن فرائض و واجبات کہاں تک انجام دیتا ہے۔؟ اور نیکی میں اس کی دوڑ کہاں تک ہے؛ سوال صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ کس فرقہ کے خرافات (جنہیں غلط طور پر "عقائد" کا نام دے دیا گیا ہے) مانتا ہے وہ کیتھولک ہے یا پروٹسٹنٹ؛ تم سے یہ کوئی نہیں پوچھے گا۔ کہ خدا سے ڈرتے بھی ہو یا نہیں؛ لیکن ہر کوئی اس بات پر تمہاری جان لینے کے لئے تیار ہو جائے گا کہ تم فلاں ولی کی کرامت کے قائل بھی ہو یا نہیں؛ دین اپنی اصلی شکل میں صاف سادہ، ستھرا تھا۔ اسے ان جبہ پوشوں نے خرافات و خزعبلات اور غیر مفہوم قیل و قال کا غیر مرتب مجموعہ بنا دیا ہے۔ اگر تم اس تمام کثافت سے جو آجکل دین کے نام سے موسوم ہے۔ از سر تا پا آلودہ ہو۔ تو بس، تم مومن کامل ہو۔ اب تمہیں کسی نیکی کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ سیدھے آسمان کی بادشاہت (جنت) میں داخل ہو جاؤ گے۔!"

"انسانی جماعت کو دین سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ جبکہ دین اتنی پست سطح پر آجائے؟ اس صورت میں دین کا کیا رہ جاتا ہے؟ صرف یہ کہ انسانوں میں بغض و عداوت کی تخم ریزی کرے اور خونریز میدانوں کا سامان بہم پہنچائے

بلاشبہ جب دین اس حالت میں آجائے۔ تو اس کے وجود سے اس کا عدم کہیں زیادہ بہتر ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ دین کو اس پستی سے نکالیں۔ انسانیت کے ہم پہ حقوق ہیں۔ یہی حقوق ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ دین کو خرافات سے پاک کر کے اصلی صورت میں پیش کر دیں۔ تمہاری یہ سزائیں، دھمکیاں پھانسیاں اور آگ کے شعلے ہمیں ہرگز مرعوب نہیں کر سکتے۔"

عہد جدید کی پیش گوئی

جب لوگوں کی آنکھوں پہ سے پردہ اٹھے گا اور حقیقت نظر آئے گی تو بلاشک و شبہ وہ موجودہ دین کو حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیں گے۔ کیونکہ یہ حقیقی دین نہیں ہے۔ وہ سب سے پہلا کام یہ کریں گے کہ ان خود غرض اور ریاکار پیشواؤں کے احترام سے انکار کر دیں۔ وہ ان سے کہیں گے۔ تم ہی نے ہمارا دین بگاڑا اور تم ہی ہماری شقاوت کا سبب ہو۔ جب وہ مبارک زمانہ آنے لگا۔ تو اس کا سب سے زیادہ مبارک عمل یہی ہو گا۔"

خاتمہ

اپنا جواب روسو اس عبارت پر ختم کرتا ہے۔

اے اسقف اعظم! تم اور تمہارے گروہ کے لئے جائیں بنانا بہت آسان ہے۔ تم لوگ اپنے حقوق کے سوا دوسروں کے حقوق نہیں جانتے۔ تمہیں صرف

وہی قانون معلوم ہیں جن سے غیروں کو جکڑتے ہو۔ خود اپنے نفس کے مقید کرنے والے قانون تمہاری کتاب میں نہیں لکھے گئے تم صرف اتنے ہی پر قانع نہیں ہو۔ کہ عدالت و انصاف سے بالاتر رہو بلکہ انسانی عواطف وجذبات کا بھی اپنے تئیں پابند نہیں سمجھتے، تم کمزور پر تکبر سے ظلم کرتے ہو۔ اور تم سے کوئی باز پرس نہیں کرتا۔ لوگوں کی توہین تمہارے لئے ویسی ہی آسان ہے جیسی ان کے لئے تمہاری سنگدلی سہل ہے۔ تم ہمیں اس طرح روندتے ہو جس طرح خاک روندی جاتی ہے تم کبھی ہمیں آگ میں جلاتے ہو۔ کبھی سولی پر چڑھاتے ہو۔ کبھی صرف توہین وتذلیل پر اکتفا کر لیتے ہو تمہارے قہر وغضب کے لئے ضروری نہیں کہ ہم سے کوئی خطا بھی سرزد ہوئی ہو۔ اگر تمہاری مصلحت کا اقتضا یہی ہے تو پھر اثبات جرم کے لئے کسی بات کی ضرورت نہیں اور ہمیں شکایت کرنے کی بھی اجازت نہیں۔ اگر ہم اس کی جرأت کریں، کہ اپنی برأت اور تمہاری غلطی ظاہر کریں تو ہم گستاخی کے مجرم قرار دیئے جاتے ہیں۔

اسقف سے آخری خطاب

اے میرے آقا! آپ نے مجھ پر علانیہ طعن وتشنیع کی۔ بلکہ مجھے گالیاں بھی دے ڈالیں۔ اگر میری طرح آپ بھی کوئی معمولی آدمی ہوتے اور میں اپنی کتاب کے ساتھ آپ کو عدالت کے سامنے لے جا سکتا۔ تو آپ دیکھ لیتے کہ عدالت کا فیصلہ آپ کے حق میں اتنا ہی سخت ہوتا جتنا سخت یہ گناہ ہوا ہے۔ لیکن آپ ایک ایسی

جماعت میں سے ہیں جو منصف و عادل ہونے سے ہمیشہ کے لئے مستثنیٰ کر دی گئی ہے۔ رہا میں، تو میں ایک محض بے حقیقت آدمی ہوں۔ مجھے اتنا اور کہنے کی اجازت دیجئے۔ کہ آپ دینی پیشوا ہیں۔ انجیل کے عالم ہیں۔ آپ کا فرض ہے کہ مخلوق کو اس کے فرائض کی تعلیم دیں لیکن یہ تعلیم خود اپنے نفس سے شروع ہونی چاہیئے۔ آپ کو ایک لمحہ کے لئے سوچنا تھا۔ کہ میرے معاملہ میں آپ کا فرض کیا تھا؟ اور کہاں تک تھا؟ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور کچھ کہنے کو باقی نہیں رہا۔ اس لئے چپ ہو جاتا ہوں!"

نپولین

انسان ذہن و جسم کی کتنی ہی عظمتیں حاصل کر لے۔ لیکن روح اور اخلاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ پاکیزگی بھی حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر اس کا اعتقاد اور عمل روحانی ہدایت کی روشنی سے محروم ہے!

انسان کے لئے سہل ہے کہ تمام دنیا فتح کر لے۔ سکندر نے تمام دنیا کی سلطنتیں تہ و بالا کر ڈالی تھی۔ انسان کے لئے یہ بھی دشوار نہیں کہ ذہن و فکر کی ایسی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ جہاں تک دوسروں کے قدم نہ پہنچ سکے ہوں۔ ارسطو، اقلیدس، سولن اور سنیکا جیسے فاتحین علم کی فتح مندیاں لازوال ہو چکی ہیں۔ اور دنیا منطق، ریاضی، قانون اور فلسفۂ اخلاق میں آج تک ان کی پس رو ہے۔ انسان کی اولوالعزمی ان بلندیوں پر بھی نہیں رکتی۔ کچھ مشکل نہیں اگر وہ آگ کے شعلوں میں کود پڑے سمندر کی موجوں کی ہنسی اڑائے، پہاڑوں کی صفیں چیر ڈالے۔ لیکن ہاں یہ مشکل

ہے ۔ بہت ہی مشکل ہے ۔ کہ وہ اخلاق اور روحانی پاکیزگی کی راہ میں اپنی کسی ایک خواہش نفس کا بھی مقابلہ کر سکے ۔ اس کی ساری اولوالعزمی اور کوہ ہمتی جو دنیا کی ساری روکاوٹوں کا تن تنہا مقابلہ کر سکتی ہے ۔ ہوائے نفس کی ایک ادنیٰ سی روکاوٹ بھی اپنی راہ سے ہٹا دینے پر قادر نہیں ہوتی ۔ سکندر تمام دنیا کی تسخیر کی محنت سے نہیں تھکا ۔ لیکن بابل کی ایک عورت جب اس کے سامنے آئی تو اپنی خواہشِ نفس کے اضطراب سے بے بس ہو کر گر پڑا ۔ سینیکا نے تمام نوع انسانی کو اخلاق اور اخلاقی سعادت کی دعوت دی ۔ لیکن خود اپنے آپ کو ایک دوسرے انسان کی منکوحہ عورت سے باز نہ رکھ سکا ۔ ارسطو کے دامنِ علم کے دھبے بھی دنیا گن چکی ہے ۔ اور یونان کی ایک قدیم ضرب المثل ہمیں بتلاتی ہے ۔ " بڑے انسان بنو ۔ اگر نیک انسان نہیں بن سکتے ! "

فی الحقیقت انسانی زندگی کی یہی اخلاقی اور عملی نامرادی ہے ۔ جو الہامی ہدایت کی کسی بالاتر قوت کی ضرورت تسلیم کرنے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ انسان اپنے ذہن و جسم کی قوتوں سے سب کچھ لے سکتا ہے ۔ لیکن تکلف اور بناوٹ سے بھی اپنے آپ کو نیک نہیں بنا سکتا ۔ اگر انسانی زندگی کی سعادت کے لئے اس عملی صداقت کی بھی کچھ ضرورت ہے ۔ جسے نیکی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے ۔ تو ناگزیر ہے کہ عام انسانی سطح سے کوئی بلند تر ذریعہ ارشاد و ہدایت کا ہو ۔ مذہب اور الہام اسی ذریعہ ہدایت کا نام ہے ۔

نپولین اعظم

اٹھارھویں صدی میں نپولین بونا پارٹ کا ظہور بھی انسانی اولوالعزمی کا ایک عظیم ظہور تھا۔ شائد ہی یورپ کے کسی انسان کی نسبت دنیا نے اس قدر کہا اور سنا ہو۔ جس قدر اس غیر معمولی انسان کی عجیب و غریب دماغی قوتوں کی نسبت کہہ سن چکی ہے۔ تاہم انسانی عظمت کی اخلاقی نامرادی کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔ کہ یہی نپولین جب میدان جنگ سے باہر اپنے گھر کی محفوظ زندگی میں دیکھا جاتا ہے۔ تو اس میں اتنی قدرت بھی نظر نہیں آتی کہ نہایت ادنیٰ درجے کی اخلاقی کمزوریوں سے اپنے آپ کو باز رکھے رہا

حال ہی میں جرمنی کے ایک اہل قلم گیر ٹرڈ ارٹیز نے ایک کتاب "نپولین اور اس کی دوست عورتیں" لکھی ہے۔ اور اس میں مستند تاریخی ذرائع سے وہ تمام شہادتیں جمع کر دی ہیں۔ جو نپولین کی عاشقانہ بوالہوسیوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہو گیا ہے۔ اور دو تین ہفتہ سے انگلستان اور یورپ کے اکثر اخبارات و رسائل کا موضوع بحث ہے۔ ہم اس کی بعض تاریخی داستانیں قارئین کی عبرت و بصیرت کے لئے درج کرتے ہیں۔

سولہ برس کی عمر میں عشق

محبت کے باب میں نپولین کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے۔ کہ "محبت

کا ہل آدمی کا دل بہلاوا ہے" ممکن ہے نپولین نے یہ اس وقت کہا ہو۔ جب وہ پاک دامن تھا۔ لیکن بعد میں ——— اگر مخالف مؤرخین کی روایت تسلیم کر لی جائے تو اس نے اس قول کی بنا پر حسن و ہوس کی زندگی سے اجتناب نہیں کیا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی حسینہ سے وابستہ رہا۔

آغاز شباب میں نپولین مارسیلز اور پیرس کی سڑکوں پر پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھرا کرتا تھا۔ نہ تو اس کی ہیئت سے کسی کو دولت کا شبہ ہو سکتا تھا۔ نہ اس میں ظاہری حسن و جمال ہی کچھ ایسا غیر معمولی تھا۔ کہ کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لے تاہم یہ واقعہ ہے۔ کہ اس زمانہ میں بھی بکثرت عورتیں اس پر عاشق ہو گئی تھیں کیونکہ فی الواقع اس میں کوئی ایسی نا معلوم کشش موجود تھی۔ جو دلوں کو لبھا لیتی تھی۔ ممکن ہے اس کا شرمگیں انداز اور اس کے پُر غور چہرہ کی عجیب اداسی اس کے دیکھنے والوں کے دلوں میں محبت پیدا کر دیتی ہو۔

کہا جاتا ہے کہ نپولین ۱۶ برس کی عمر میں جب والنسا میں رہتا تھا تو وہاں کی بہت سی حسین عورتیں اس پر فریفتہ ہو گئی تھیں۔ مگر خود اسے بجز ایک کے کسی سے دلچسپی نہیں ہوئی۔ اس دوشیزہ کا نام " کارولین کرلومبیا" تھا۔ وہ نہایت نازک اندام اور خوبصورت تھی۔ ایک مرتبہ خود نپولین نے اس لڑکی کے متعلق کہا تھا۔ اس وقت دنیا میں کوئی دو شخص ایسے خوش نصیب نہ تھے۔ جیسے ہم دونوں تھے۔ ہم ایک ایسی پاک محبت کے مزے لوٹ رہے تھے۔ جیسی خواب میں کسی انسان نے دیکھی ہو گی ... اکثر ہم دونوں باغوں میں چلے جاتے اور درختوں پر چڑھتے

اترتے۔ بارہا ہم دن دن بھر مخلوق کی نظروں اور شہر کے شور و غل سے دور بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔

لیکن امتدادِ زمانہ نے نپولین کے دل سے اس دوشیزہ کی یاد محو کر دی۔ اور اسے اپنی ایک ہم وطن لڑکی سے عشق ہو گیا۔ نپولین شروع ہی سے مستبد تھا اس نے اپنی محبوبہ کو سختی سے حکم دے دیا۔ کہ اس کے سوا کسی کو بھی مسکرا کر نہ دیکھے۔ لڑکی کے دل میں اس جابرانہ حکم سے نفرت پیدا ہو گئی۔ اور اس کے پنجہ سے نکلنے کے لئے اس نے ایک دن شراب میں زہر ملا دیا اور نپولین مرتے مرتے بچا!

ادھیڑ عورت سے عشق

اس واقعہ سے کچھ عرصہ بعد نپولین کو ایک ادھیڑ عورت "میڈیم پرمون" سے محبت ہو گئی اور اس قدر بڑھی کہ ایک لمحہ بھی اس کی جدائی گوارا نہ تھی۔ ایک دن نپولین نے اس سے باضابطہ شادی کر لینے کی درخواست کی۔ عورت نے اس خواہش پر زور سے قہقہہ لگایا۔ "تم بے وقوف ہو گئے ہو۔ مضحکہ بننا چاہتے ہو! بھلا لوگ کیا کہیں گے؟ بیوی ہونے کے بجائے میں تمہاری ماں بننے کے زیادہ قابل ہوں!" نپولین پر یہ بات بہت ناگوار گزری اور قطع تعلق کر لیا۔

نپولین کا طریقِ محبّت

ایک مورخ کا بیان ہے کہ نپولین نے بے شمار عورتوں کا دل توڑا ہے اس

کی عادت تھی کہ تعلقات بڑھائے جاتا تھا۔ اور جب عورت اس کے دامِ محبت میں پھنس جاتی تھی۔ تو بے اعتنائی سے بالکل چھوڑ دیتا تھا۔ چنانچہ "میڈیم ولسکا" پولینڈ کی ایک حسینہ کا واقع اس بات کا کافی ثبوت ہے۔ نپولین نے اس عورت کو دیکھا اور لبھانا چاہا۔ مگر اس نے سخت نفرت کا اظہار کیا۔ نپولین نے اسے قبضہ میں لانے کی بہت کوشش کی۔ مگر وہ برابر بیزار رہی آخر ایک دن غضبناک ہو کر چلایا۔ "تو دیکھ لے گی، میں تجھے کس طرح زیر کرتا ہوں! تجھے میرے ارادہ کے سامنے جھکنا پڑے گا! دیکھ، یہ میرے ہاتھ میں گھڑی ہے۔ جس طرح میں یہ گھڑی چورہ چور کئے ڈالتا ہوں۔ اسی طرح پولینڈ کا ملک بھی پاش پاش کر کے پھینک دوں گا!" اس نے یہ کہا اور گھڑی زور سے دیوار پہ مار دی۔ اس حرکت کا عورت پہ اتنا شدید اثر ہوا۔ کہ وہ بے ہوش ہو کر نپولین کے قدموں پر گر پڑی۔ لیکن چند دنوں کے بعد نپولین نے اسے اکتا کر چھوڑ دیا!!

محبّت میں استبداد

عشق و محبت کے میدان میں بھی اس شخص کے ظلم و استبداد کے قصے مشہور ہیں۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ غربت کے زمانہ میں جب نپولین اور اس کا بھائی مارسیلز کے بازاروں میں پھرا کرتے تھے۔ اتفاق سے ریشم کے ایک سوداگر "فرانسوا کلاری" کے خاندان سے ان کا تعارف ہو گیا۔ اس تاجر کی دو لڑکیاں تھیں۔ بڑی کا نام "جولیا" اور چھوٹی کا "ڈیزیرا" تھا۔ نپولین نے شروع

میں جولیا کو پسند کیا اور اس کے بھائی نے ڈیزیرا کو۔ تھوڑے دن بعد نپولین اپنی محبوبہ سے سیر ہو گیا، اور بھائی کی محبوبہ پر قبضہ جمانا چاہا۔ چنانچہ ایک موقعہ پر جب یہ چاروں عاشق و معشوق جمع تھے۔ نپولین نے تحکمانہ انداز میں کہا "جوزف! تم اور تمہاری محبوبہ دونوں غیر مستقل مزاج ہو۔ لیکن مجھ میں اور میری محبوبہ میں استقلال ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم تم تبادلہ کریں۔ تاکہ تمہارا نقص جولیا پورا کر دے اور میں ڈیزیرا کی کمی پوری کر دوں۔" یہ عجیب و غریب فلسفہ بیان کر کے اس نے اپنے بھائی کی محبوبہ کو اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ اور کسی کو بھی مخالفت کی جرأت نہ ہوئی!

لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد نپولین نے محسوس کیا کہ عزت و عظمت کی راہیں اس کے سامنے کھلی ہیں۔ لہٰذا ڈیزیرا کو یک قلم چھوڑ دیا۔ اور اس کی منتوں اور آنسوؤں کا ذرا بھی خیال نہ کیا۔

جوزیفائن سے عشق

اس کی طبیعت کچھ ایسی بے چین واقع ہوئی تھی۔ کہ ایک ہی حالت پر چلے جانا اسے پسند نہ تھا۔ سابق محبت سے دست بردار ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ جوزیفائن پر فریفتہ ہو گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں جب نپولین بامِ عزت کی ابتدائی سیڑھیوں پر تھا۔ اس کے پاس ایک کم عمر لڑکا آیا اور اپنے باپ کی تلوار واپس مانگی۔ یہ لڑکا فرانس کے مشہور سپہ سالار وائکونٹ الگزنڈر کا بیٹا تھا۔ جسے فرانسیسی انقلاب کے زمانے میں پھانسی دی گئی تھی

نپولین بچہ کی جرأت و فصاحت سے بہت خوش ہوا اور اس کی درخواست منظور کر لی۔ دوسرے دن اس کی ماں شکریہ ادا کرنے آئی۔ یہی جوزیفائن تھی نپولین پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہو گیا۔

مؤرخین کا بیان ہے۔ کہ دوسرے دن خود نپولین جوزیفائن کے چھوٹے سے مکان پر گیا۔ جوزیفائن واقعی بہت خوبصورت تھی۔ ساتھ ہی عقلمند بھی تھی اس نے محسوس کر لیا کہ نپولین اس کی چشم و ابرو کا شکار ہو گیا ہے۔ چونکہ اسراف کی وجہ سے سابق شوہر کی تمام دولت خرچ کر کے مقروض ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے بھی اس نئی دعوتِ عشق کا پوری سرگرمی سے استقبال کیا۔ اور تعلقات بڑھانا شروع کر دیئے۔ چند ماہ کی آمدورفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ مارچ ۱۷۹۶ء میں جنرل بوناپارٹ اور جوزیفائن کی شادی ہو گئی۔ دلہن کی عمر دولہا سے سات سال زیادہ تھی۔ مگر نکاح نامہ میں اس کی عمر ۲۹ برس لکھی گئی۔ اور نپولین کی ۲۶ برس!"

شادی کے دو دن بعد نپولین کو اٹلی کے حملہ پر جانا پڑا۔ سخت مصروفیت تھی مگر جوزیفائن کی یاد ہر وقت تازہ رہتی تھی۔ ہر منزل پر سے خط کے ساتھ قاصد بھیجتا، اور اپنی حالت سے اسے آگاہ کرتا رہتا تھا۔ پہلے خط میں لکھا تھا۔ "جب میں اپنے دل پر ہاتھ رکھتا ہوں، تم اس میں موجود ملتی ہو۔ جس سے مجھے بڑی تسکین ہوتی ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی غم ہے تو صرف تمہاری فرقت کا۔"

جوزیفائن کی تصویر ہر وقت اس کے پاس رہتی تھی۔ جب کبھی نگاہ ڈالتا تھا، تصویر نکال کر سامنے رکھ لیتا تھا جب کوچ کرتا تھا تصویر جیب میں رکھ لیتا تھا بیان کیا جاتا ہے کہ وینس میں اس کے ہاتھ سے تصویر کا آئینہ چھوٹ کر ٹوٹ گیا۔ اسے اس نے فال بد سمجھا۔ قریب تھا کہ جوزیفائن کی طرف سے بالکل ناامید ہو جاتا مگر اس نے فوراً خط لکھا "کاش تمہارے پر ہوتے اور تم اڑ کر میرے پاس آجاتیں!"

لیکن جوزیفائن اپنی رنگ رلیوں میں مصروف تھی۔ نپولین کی اسے ذرا بھی پروا نہ تھی۔ اب اسے پایۂ تخت میں بڑی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ اچھے اچھے لوگ اس کی خوشامد میں لگے تھے۔ چند ہفتہ کے اندر نپولین نے اٹلی میں عظیم الشان فتوحات حاصل کریں۔ اور اطمینان پا کر جوزیفائن کو بلا لینا چاہا۔ لیکن وہ برابر حیلے حوالے کرتی رہی۔ آخر نپولین نے سختی سے لکھا کہ فوراً چلی آؤ۔ اس مرتبہ اس نے ایک نیا عذر پیش کیا۔ اس نے لکھا کہ میں سفر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حمل سے ہوں۔ نپولین کو اس جھوٹی خبر سے بے حد خوشی ہوئی۔ اس نے فوراً خط لکھا "جوزیفائن! میں نے سخت غلطی کی۔ کس طرح اپنے گناہ کا کفارہ کروں؟ میں نے ناحق تنگ کیا۔ حالانکہ تم بیمار تھیں۔ سچ ہے، محبت انسان کو اندھا کر دیتی ہے . . . . کاش ایک ہی دن کے لئے میں تمہارے پہلو میں ہوتا!"

نیز اپنے بھائی کو لکھا "جوزیفائن کی علالت نے میرے ہوش اڑا دیئے

ہیں۔ کاش میں اسے لکھ سکتا۔ اس کی محبت جنون کے درجہ تک پہنچ گئی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ خدانخواستہ اگر وہ مرگئی تو زندگی میں میرے لئے کوئی لطف باقی نہ رہے گا!"

لیکن چند ہی دن بعد نپولین کو معلوم ہو گیا۔ کہ جوزیفائن نے دھوکا دیا تھا وہ بالکل اچھی ہے۔ اور پیرس میں ضیافتیں دے رہی ہے۔ اب اس کے غصّہ کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے فوراً تلخ لہجہ میں خط لکھا، اور حکم دیا کہ بلا کسی عذر کے روانہ ہو جائے۔ جوزیفائن بادلِ نخواستہ روانہ ہو گئی۔ میدان میں نپولین نے بڑی مسرت سے استقبال کیا۔ مگر چند ہی دن بعد اسے پھر میدانِ جنگ میں جانا پڑا۔ کیونکہ فوج ایک خطرہ میں پھنس گئی تھی۔ خطرہ دور کر کے اس نے پھر اسے طلب کیا۔ خط میں لکھا تھا۔ "جدائی کے وقت تمہارے آنسوؤں نے میرے دل کو سخت مایوس کر دیا تھا۔ میری عقل جاتی رہی تھی۔ اب یہاں میرے پاس آجاؤ۔ تاکہ مرنے سے پہلے ہم یہ کہہ سکیں کہ ہم نے بھی چند دن خوشی کے دیکھے ہیں۔" مؤرخ مین کا بیان ہے کہ نپولین، جوزیفائن کے سامنے اس طرح کھڑا ہوتا تھا۔ گویا کسی مقدس دیوی کے حضور میں کھڑا ہے!۔

نپولین کا رقیب

جوزیفائن اپنے شوہر کے حسب الحکم جنگی پڑاؤ میں آگئی۔ یہاں چارلس نام فوج میں ایک کم رتبہ افسر تھا۔ کم عمر اور خوبصورت تھا۔ حتیٰ کہ کہا جاتا ہے کہ

نپولین کی فوج میں اس سے زیادہ حسین آدمی کوئی نہ تھا۔ جوزیفائن اسے دیکھتے ہی فریفتہ ہو گئی۔ یا تو فوج میں رہنے سے بیزار تھی۔ یا اب فوج سے جدا ہونا گوارا نہیں کرتی تھی۔ دونوں میں شناسائی ہوئی۔ اور تعلقات بڑھے اور اتنے بڑھے کہ خود نپولین نے محسوس کر لیا۔ اسے نہایت غصہ ہوا۔ مگر ضبط سے کام لیا۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ اپنے رقیب کو فوج سے نکال کر پیرس بھیج دیا۔ اور حکم دیا کہ آئندہ احکام کا منتظر رہے۔ اپنے شوہر کی اس کارروائی سے جوزیفائن کو سخت صدمہ ہوا۔ مگر مجبور تھی۔ کچھ کر نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی پھوپھی کو ایک خط میں لکھتی ہے۔ "زندگی سے اکتا گئی ہوں، موت کی تمنائیں کر رہی ہوں!"

جنگ اٹلی سے فارغ ہو کر دونوں میاں بیوی بڑی شان و شوکت سے پیرس لوٹے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد نپولین کو پھر جوزیفائن سے علیحدہ ہونا پڑا۔ وہ مصر کی مہم پر روانہ ہو گیا۔ اور بیوی سے وعدہ لے لیا، کہ جنگ ختم ہوتے ہی مصر چلی آئے گی۔ مگر ابھی وہ مالٹا ہی پہنچا تھا کہ عیش پسند عورت نے خاوند کو یک قلم بھلا دیا اور جلسے شروع کر دیئے۔ نپولین اب فرانس میں اس قدر ہر دلعزیز ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی کی آزادیوں پر تمام پیرس ملامت کر رہا تھا۔ مگر خود اسے کچھ پروا نہ تھی۔ بہت جلد نپولین کو تمام روداد معلوم ہو گئی۔ کہا جاتا ہے کہ اسی زمانہ میں اسے سب سے پہلے جوزیفائن کو طلاق دینے کا خیال پیدا ہوا تھا۔

جوزیفائن سمجھتی تھی کہ نپولین شاید کبھی واپس نہ آئے گا۔ یا بہت مدت کے بعد آئے گا۔ اسی لئے بالکل بے باک ہو گئی تھی۔ مگر اچانک اسے خبر ملی کہ اس

کا شوہر مصر سے آ گیا ہے۔ اور عنقریب پیرس پہنچنے والا ہے۔ بہت خوفزدہ اور پریشان ہوئی۔ ایک طرف اپنی بے اعتدالیوں کا خوف تھا۔ دوسری طرف سخت مقروض بھی ہو گئی تھی۔ حیران تھی، شوہر کو کیا جواب دے گی؟ مگر تھی چالاک فوراً پیرس سے استقبال کے لیئے روانہ ہو گئی۔ نپولین کو بھی اس کی روانگی کی خبر مل گئی تھی۔ اس نے بالکل مختلف راستہ اختیار کیا۔ اور محل میں آ کر تمام دروازے بند کر لیئے۔ جوزیفائن اپنی تدبیریں ناکام ہو کر سرعت سے لوٹی اور سیدھی محل کی طرف روانہ ہو گئی۔ مؤرخ مین کا بیان ہے "جوزیفائن محل کے دروازہ پر کھڑی دستک دیتی رہی۔ مگر نپولین نے کوئی بھی شنوائی نہیں کی۔ پھر اس نے اپنے گھٹنوں پر جھک کر پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کیا۔ مگر اس پر بھی سپہ سالار نے مطلقاً پروا نہ کی۔ اس حالت پر پورا دن گزر گیا۔ مگر دروازہ نہیں کھلنا تھا نہ کھلا۔ اب جوزیفائن بالکل تھک گئی۔ ناامید ہو کر واپس جانے والی تھی کہ اس کی ایک سہیلی اس کے دونوں بچوں اوجین اور ہورٹانس کو لے آئی۔ انہوں نے رکوع کر کے اپنے سوتیلے باپ کو پکارنا اور اپنی ماں کے لیئے رو رو کر سفارشیں کرنا شروع کیا۔ معصوم بچوں کی آواز سن کر نپولین کا دل نرم پڑ گیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ پھر جوزیفائن کو اٹھایا، آنسو پونچھے، معاف کیا۔ اور اس کا بیس لاکھ فرنک قرضہ بھی ادا کر دیا۔

جوزیفائن کو طلاق

اس کے بعد جوزیفائن نپولین کے ساتھ رہی۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو

اس نے ملکہ فرانس کا تاج پہنا۔ اور شہنشاہی کی عزت و عظمت کے ساتھ زندگی بسر کرتی رہی۔ یہانتک کہ نپولین کو اپنے بعد اپنے جانشین کی فکر ہوئی۔ اس خیال نے دوسرے سیاسی مصالح کے ساتھ مل کر اسے جوزیفائن کی طلاق پر مجبور کر دیا۔ چنانچہ طلاق دے دی گئی۔ اور نپولین نے شہنشاہ آسٹریا کی لڑکی میری سے شادی کر لی"

مشہور ہے۔ کہ آسٹرین بیوی کو اپنے شوہر سے ذرا بھی محبت نہ تھی۔ بلکہ سخت نفرت کرتی تھی۔ جیسا کہ ابھی بیان ہوگا۔ نپولین جزیرہ سینٹ ہیلانا میں بستر مرگ پر اپنے ڈاکٹر کو وصیت کی تھی کہ موت کے بعد اس کا دل شیشہ میں رکھ کر اس کی بیوی کے پاس لے جائے۔ لیکن جب ڈاکٹر ملکہ کے پاس پہنچا۔ تو اسے ایک کانے عہدہ دار سے تعشق کرتے پایا۔ ملکہ نے نپولین کا جواب سن کر کہا "میں نے اس کی محبت کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی۔ اگرچہ میں یہ یاد رکھنے پر مجبور ہوں۔ کہ وہ میرے لڑکے کا باپ ہے۔"

میڈم پولین سے محبت

اس عورت سے نپولین کو مصر میں عشق ہوا تھا۔

گیرٹرڈ آرٹیز (Gertrude Arbtez) جس کی جدید الشیوع کتاب کا ذکر ان صفحات پر ہو چکا ہے۔ میڈم پولین کی نسبت لکھتا ہے۔

اس معاملہ کی تفصیل یہ ہے کہ ۹ رمئی ۱۷۹۸ء کو نپولین مصر کی فتح کے لئے روانہ ہوا۔ وہ اپنے دو دشمنوں سے بہت زیادہ خائف تھا۔ اور اس کی آنکھ بچا کر

نکل جانا چاہتا تھا۔ یعنی انگریزی امیر البحر نلسن، اور انگریزی جاسوس جان بارنٹ۔
اس سفر میں نپولین نے چند خاص عورتوں کے سوا عورتوں کی رفاقت ممنوع قرار دے دی تھی۔ جن عورتوں کو چلنے کی اجازت دی گئی تھی۔ ان میں خود اس کی داشتہ میڈم ورڈیا بھی تھی جسے وہ اٹلی سے اپنے ساتھ لایا تھا۔

اس فوج میں لیوفورلیس نامی ایک فوجی افسر تھا۔ اس نے حال ہی میں شادی کی تھی۔ اس کا دل اپنی بیوی کی جدائی پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ عورتوں کو ساتھ لے جانے کی ممانعت تھی بالآخر اس نے یہ ترکیب نکالی۔ کہ بیوی کو سپاہی کی وردی پہنا کر اپنے ساتھ لے لیا۔ تاکہ دونوں بے روک ٹوک ساتھ رہ سکیں!"

اس وقت کے اکثر مؤرخین کا بیان ہے کہ ماہ اگست میں نپولین نے قاہرہ کے باہر ایک جلسہ کیا تھا جس میں اس کا پورا جنگی اسٹاف اور تمام عورتیں بھی شامل تھیں۔ اسی جلسہ کے موقعہ پر نپولین نے میدان میں اپنی فوج کا ایک دستہ گھوڑوں پر سوار دیکھا۔ سپاہیوں میں ایک شخص غایت درجہ خوش آواز، خوبصورت اور دلربا تھا۔ نپولین نے جنرل برتیہ کو حکم دیا کہ اس شخص کا پتہ لگائے۔ اسی دن شام کو جنرل نے یہ عجیب خبر سنائی "کہ وہ سپاہی مرد نہیں ہے۔ عورت ہے اور بائیسویں رسالہ کے ایک افسر کی بیوی ہے۔"

دوسرے دن نپولین نے جنرل کو ایک دعوت منعقد کرنے کا حکم دیا۔ اس

میں بڑے بڑے جنرل، افسر اور ان کی عورتیں مدعو کی گئی تھیں، خصوصاً میڈم فوریس بھی خصوصیت کے ساتھ بلائی گئی تھیں۔

چنانچہ دعوت کا جلسہ منعقد ہوا۔ میڈم بغیر اپنے شوہر کے بلائی گئی تھی۔ اس کے شوہر نے شروع میں جانے سے منع کیا، لیکن پھر ڈر کر اجازت دے دی۔ چنانچہ تمام مہمان جمع ہو گئے۔ حسب معمول نپولین برآمد ہوا۔ سب تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ وہ لوگوں سے ہنستا بولتا جنرل تک پہنچا۔ جس کے پاس میڈم فوریس اور متعدد ممتاز سپہ سالار کھڑے تھے۔ جنرل اپنے قائد کا خیر مقدم بجا لایا، تشریف آوری پر شکریہ ادا کیا۔ اور ایک پیالی چائے نوش کر لینے کی درخواست منظور ہوئی اور نپولین بیٹھ گیا۔ میڈم بالکل اس کے مقابل کھڑی تھی۔

میڈم فوریس نے دیکھا سپہ سالار اسے پر معنی نظروں سے دیکھ رہا ہے وہ بہت کم عمر تھی، شرما گئی۔ نپولین اس کی حالت کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ مگر بالکل خاموش رہا۔ چائے جلدی سے پی لی اور بغیر ایک لفظ کہے جلسہ سے اٹھ گیا۔

مہمانوں نے رات کا کھانا کھایا۔ اور کافی پینے لگے۔ میڈم فوریس جس میز پر تھی، اس کے ایک طرف جنرل ڈی بوری بیٹھا تھا۔ دوسری طرف جنرل جونو۔ آخر الذکر نے کافی کی بھری ہوئی پیالی جان بوجھ کر اس طرح میڈم فوریس پر گرا دی کہ سب نے اسے اتفاقی حادثہ سمجھا۔ لوگ لپکے اور خاتون کا لباس صاف کرنے لگے جنرل جونو نے اپنی غفلت پر بڑی فصاحت سے ندامت کا اظہار کیا۔ فوراً

کانی کا دہ حصّہ پانی سے دھلوایا گیا۔ جس سے میڈم کا لباس اور زیادہ بھیگ گیا۔ اس پر جنرل نے کہا۔ "آپ کپڑا خشک کرنے کے لئے مکان کی بالائی منزل پر چلی جائیے"۔ میڈم فوریس چلی گئی۔ وہاں نپولین منتظر بیٹھا تھا۔!

دعوت کے تیسرے دن میڈم کے شوہر فوریس کو حکم دیا کہ جنرل برتیہ سے ملاقات کرے۔ جنرل نے بشاشت سے افسر کا خیر مقدم کیا۔ اور کہا۔ دوست! تم بڑے ہی خوش نصیب ہو۔ کیونکہ فرانس جا رہے ہو۔ سپہ سالار تمہیں ایک خفیہ مہم پر پیرس بھیج رہا ہے۔ ایک گھنٹہ کے اندر روانہ ہو جاؤ۔ یہ لو اسکندریہ کے سپہ سالار کے نام حکم ہے۔ کہ تمہارے سفر کے لئے ہر طرح کی سہولتیں بہم پہنچاؤ۔

فوریس بدحواس ہو گیا۔ حیران تھا کہ کیا جواب دے؟ آخر کار افسردگی سے جنرل کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا۔ "اگر مجھے فوراً ہی روانہ ہو جانا ہے۔ تو میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے جاؤں گا۔"

جنرل نے غصّہ سے کہا "بیوی! کیا تم یہ جانتے ہو کہ ایک ایسے نازک کام میں اپنے ساتھ اپنی بیوی کو لے جا سکتے ہو۔؟ خصوصاً جب کہ راستہ میں انگریزی بیڑہ موجود ہے۔ اور تمہیں قید کر کے لے جا سکتا ہے؟"

اب غریب فوریس کے لئے بجز اطاعت کے کوئی چارہ نہ تھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۷۹۸ء کو اسکندریہ پہنچا اور فرانسیسی جہاز "شاسور" نامی پر سوار ہو گیا۔ اس جہاز کا کپتان لارنس تھا۔

لیکن نورلیس یہ دیکھ کر نہایت متعجب تھا۔ کہ اس کا جہاز سیدھا راستہ اختیار کرنے کی بجائے کچھ عجیب پیچ د خم کے ساتھ جا رہا ہے۔ اس نے کپتان سے پوچھا، تو اس نے کہا، انگریزی بیڑا ہر طرف منڈلا رہا ہے اس سے بچکر چلنا ضروری ہے"
کپتان دراصل سکھایا پڑھایا ہوا تھا۔ اس سے کہہ دیا گیا تھا۔ کہ جہاز انگریزوں کے ہاتھ قصداً گرفتار کرا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، چند دنوں کے بعد فورلیس انگریزی بیڑہ میں قید تھا، انگریزی جنگی جہاز "لیون" نے فرانسیسی جہاز دیکھ لیا تھا۔ اور گرفتار کر لیا تھا!

یہ کہنا غیر ضروری ہے کہ اس حادثہ سے غریب فورلیس کو کس درجہ صدمہ ہوا؟ ایک طرف اپنی رفیق حیات کی جدائی کا صدمہ مارے ڈالتا تھا۔ دوسری طرف اپنی سرکاری مہم کی ناکامی کا داغ تھا۔ وہ انگریزی جہاز "لیون" کے ایک کمرے میں مقید تھا اور رہ رہ کپتان لارنس کو کوس رہا تھا۔ اگر اس نے سمندر میں غلط راستہ اختیار نہ کیا ہوتا تو یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ بڑی مصیبت یہ تھی کہ اب ایک بڑی مدت تک کے لئے وہ آزادی سے محروم ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ جنگی قیدی تھا۔ اس لئے اس کی رہائی صرف دو ہی صورتوں میں ہو سکتی تھی۔ یا تو دونوں حکومتوں میں صلح ہو جائے۔ یا باہم دگر جنگی قیدیوں کا مبادلہ کیا جائے لیکن یہ دونوں صورتیں قریب الوقوع نہ تھیں!
فورلیس اپنے غم انگیز خیالات میں محو تھا۔ یکایک اس کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ اور ایک انگریز داخل ہوا۔ یہ اس عہد کا مشہور انگریز جاسوس جان بارنٹ تھا جسے

پنولین نلسن سے کم خطرناک نہیں سمجھتا تھا۔

فورلیس نے اس کی صورت دیکھتے ہی خیال کیا۔ کہ غالباً یہ اس مہم اور اس کے مقاصد کے لسبنت سوالات کرے گا۔ جو سرکاری مراسلت لے کر فورلیس فرانس جا رہا تھا، وہ گرفتاری کے وقت ہی اس سے لے لی گئی تھی۔ سب سے زیادہ صدمہ اسے اسی مراسلت کے دشمنوں کے ہاتھ پڑ جانے کا تھا۔ وہ اپنے دل میں کہنے لگا۔ نہیں معلوم اس مراسلت میں کیسے کیسے اہم راز ہوں گے۔ جو افسوس کہ دشمنوں کے علم میں آگئے۔ بہرحال خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ میں ان کم بختوں کے سوالات کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔"

لیکن شدت حیرت سے وہ مبہوت ہو گیا جب اس نے دیکھا کہ جان بارنٹ نے وہی مراسلت جیب سے نکالی۔ اور فورلیس کو دیتے ہوئے کہا۔

"میرے دوست! یہ تمہارا سربمہر لفافہ موجود ہے دیکھ لو! ہم نے کھولنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ اس کی تمام مہریں اپنی اصلی حالت میں قائم ہیں ہمیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ اس کے مضامین سے واقف ہوں۔ یہ مراسلت تمہیں واپس دی جاتی ہے۔ اسے لے لو۔ شاہی حکم کی رو سے اب تم آزاد ہو۔ تمہیں عنقریب مصر کے ساحل پر پہنچا کر رخصت کر دیا جائے گا۔"

یہ بات صورت حال کے اس درجہ خلاف تھی۔ کہ کئی لمحہ تک فورلیس باور نہ کر سکا۔ آخر اس نے کہا۔

"کیا آپ کا واقعی یہی مطلب ہے کہ یہ مراسلت میں لے لوں، اور مجھے مصر کے

ساحل پر اتار دیا جائے گا؟"

"یقیناً" انگریز جاسوس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس لئے کہ میرے دوست! جب تم قاہرہ واپس جاؤ گے، تو دیکھو گے کہ تمہاری بیوی بونا پارٹ کی آغوش میں ہے!"

اصل واقعہ یہ ہے کہ نپولین اور میڈم فوریس کے تعلقات کی پوری سرگزشت انگریز جاسوس نے معلوم کر لی تھی۔ اسکندریہ اور دمیاط میں ان کے آدمی موجود تھے اور الفی بیک مملوک کی اعانت سے تمام مصر کی خبریں معلوم کرتے رہتے تھے جب جان بارنٹ کو معلوم ہوا کہ نپولین نے فوریس کو اس لئے روانہ کر دیا ہے۔ تاکہ مصر سے دور ہو جائے اور وہ خود اس کی بیوی کے ساتھ بے خل وغش عیش کرے، تو اس نے انگریزی بیڑہ کے افسروں کو اس کی اطلاع دے دی جب فرانسیسی جہاز کی گرفتاری کے بعد فوریس کا نام معلوم ہوا تو فوراً پہچان لیا گیا کہ میڈم فوریس کا شوہر یہی ہے وہ اسے گرفتار رکھنا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اس طرح وہ نپولین کے دلی مقصد کی تکمیل کر دیتے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ جہاں تک ممکن ہو، اسے مصر واپس کر دیا جائے۔ تاکہ نپولین کے سر پر مسلط ہو جائے۔ انگریزوں کو یقین تھا کہ فوریس جوش انتقام میں اپنے رقیب کو قتل کر ڈالے گا۔ اور اس طرح اس بلا سے انہیں نجات مل جائے گی۔

ادھر مصر میں یہ ہوا کہ فوریس کے روانہ ہوتے ہی اس کی بیوی نپولین کے قبضہ میں آگئی اور شب و روز ساتھ رہنے لگی۔ نپولین کا اب اس سے تعلق بالکل علانیہ تھا۔ چند دن بعد تمام فوج میں یہ خبر پھیل گئی۔ اور سپاہی میڈم کو "ہماری مشرق کی ملکہ" کہہ کر پکارنے لگے!

لیکن ابھی چند ہفتے بھی اس حالت پر نہیں گزرے تھے کہ اچانک فوریس قاہرہ پہنچ گیا۔ انگریزی جہاز نے نہ صرف مصر پہنچا دیا بلکہ اسکندریہ میں ایک انگریزی جاسوس نے تمام ضروری معلومات بھی بہم پہنچا دیں۔ اسے معلوم ہوگیا کہ نپولین نے قاہرہ میں ایک خاص مکان اس کی بیوی کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اور وہ بڑے امیرانہ ٹھاٹھ سے وہاں رہتی ہے۔

وہ سیدھا اس مکان کی طرف چلا۔ واقعی اس کی بیوی قیمتی لباس میں ملبوس موجود تھی۔ شوہر کو اس طرح اچانک دیکھ کر ڈر گئی اور صاف صاف نپولین کے تعلقات کا اقرار کر لیا۔ اب فوریس کے لئے غیظ و غضب ضبط کرنا ناممکن تھا۔ اس نے بے تحاشہ مارنا شروع کر دیا۔ یہاں تک کہ مارتے مارتے تھک گیا اور عورت بے دم ہو کر گر پڑی۔

اس کے بعد کیا واقعات پیش آتے ؟ ان کی تفصیلات تاریخ تک نہیں پہنچ سکیں۔ لیکن دو باتوں کا نپولین کے وقائع نگاروں نے ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ فوریس نے طلاق کی درخواست پیش کر کے اپنی بیوی سے علیحدگی کر لی تھی۔ دوسری یہ کہ فوریس مصر سے فرانس واپس آ کر عرصہ تک زندہ رہا تھا۔

جان بارنٹ کا خیال تھا کہ فوریس نپولین کو قتل کر ڈالے گا۔ لیکن نپولین ایسی ہستی نہ تھی۔ جو آسانی سے قتل کر ڈالی جاتی۔ ابھی اسے زندہ رہنا تھا۔ اور تمام یورپ کو منقلب کر دینا تھا۔

رستم بن رضا

رستم بن رضا

گذشتہ صدی کے اوائل میں روئے زمین پر ایک طوفانی آندھی آئی اس نے بادشاہوں کے تخت الٹ دیئے۔ تاجداروں کے تاج گرا دیئے۔ یہ ایک مہیب جبار تھا۔ جس کے سامنے تمام یورپ سربسجود ہو گیا تھا۔ اس مہیب آقا کے ساتھ ایک عجیب و غریب غلام بھی دیکھا جاتا تھا۔ مہیب آقا پولین تھا۔ اور عجیب الہیئت غلام رستم تھا۔

رستم بن رضا کوفان ۱۷۸۲ء میں تفلیس (قوقاز) میں پیدا ہوا۔ اس کا بچپن کوہ قاف کے مرغزاروں میں بسر ہوا تھا۔ لیکن زمانے کے انقلاب نے اس کے دل و دماغ پر اس سرزمین کے حسن و جمال طبیعت کا کوئی اثر باقی نہیں چھوڑا وہ نہ تو شاعر ہوا نہ مصور۔ اس کی قسمت میں ایک عجیب انسان کا عجیب غلام بننا تھا!"

واقعہ پیش نہیں آیا۔ البتہ ایک دن نپولین کے ساتھیوں نے ستانے کے لئے کہہ دیا کہ۔

"جنرل تمہیں اس لئے ساتھ لئے جاتا ہے۔ تاکہ پیرس کے جلسے میں تمہاری بھینٹ چڑھائے۔" سادہ لوح غلام ڈر گیا۔ اور واویلا مچانا شروع کر دیا نپولین نے سنا تو بہت ہنسا۔ اور وہ تمام رقم اسے بخش دی۔ جو دوران سفر میں اپنے ساتھیوں سے جوئے میں جیتی تھی۔

نپولین نے رستم کو مارسیلز میں چھوڑ دیا۔ ہر طرف لوگوں کی نظریں اس پر پڑتی تھیں۔ عورتیں تو اس پر ٹوٹ پڑیں۔ اس کے عجیب مشرقی اطوار اور چرکسی چشم و ابرو ان کے لئے نئی قسم کی چیز تھی۔ چند دن بعد وہ نپولین کا اسباب لے کر پیرس روانہ ہوا۔ راستے میں ڈاکو مل گئے اور تمام اسباب لوٹ لیا۔ رستم کی مرصع تلوار اور چھ ہزار فرنک کی تھیلی بھی چھین لی۔

جوزیفائن، نپولین کی بیوی رستم کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ اور اپنی خدمت میں قبول کر لیا۔ بعد میں لوگوں نے اس پر طرح طرح کی چہ میگوئیاں کیں۔ کہا گیا کہ جوزیفائن غلام پر عاشق ہے۔ اسی قدر نہیں، بلکہ یہاں تک کہا گیا۔ کہ نپولین رستم کو محض اسی نیت سے لایا تھا۔ تاکہ جوزیفائن کے لئے دلچسپی کا سامان مہیا کر دے۔ اور خود اس کی نگرانی اور رشک سے آزاد ہو جائے۔

رستم اور پیرس

کچھ ہی سبب ہو، لیکن پیرس میں رستم کے ظہور نے نپولین کی عظمت میں غیر معمولی

اضافہ کر دیا تھا۔ رستم اپنے بیش قیمت لباس میں "قنفصل" (نپولین) کے ساتھ ساتھ پھرا کرتا تھا۔ اور پیرس کی مخلوق اسے دیکھ کر متحیر رہ جاتی تھی۔"

قنفصل مقرر ہونے کے بعد نپولین اس محل میں اٹھ گیا۔ جو حکومت نے اسے دیا تھا۔ رات کو اس کے خاص کمرے کی نگہبانی رستم ہی کے ذمے تھی۔ وہ رات بھر دروازے پر پڑا رہتا تھا۔ اور کسی کو اندر جانے نہیں دیتا تھا۔"

ایک دن جوزیفائن کو معلوم ہوا کہ نپولین کے ساتھ ایک عورت موجود ہے۔ وہ غصے میں بھری ہوئی اٹھی اور کمرے میں گھس جانا چاہا۔ مگر رستم دروازے پر سو رہا تھا۔ اس کے خراٹے اتنے بلند اور خوفناک تھے۔ کہ جوزیفائن ڈر گئی۔ شمع ہاتھ سے گر پڑی، اور بدحواس الٹے پاؤں بھاگی۔

دن کے وقت رستم کے فرائض یہ تھے۔ کہ صبح اپنے آقا کو حجامت میں مدد دیتا تھا۔ نپولین نہایت تنک مزاج تھا۔ بار بار چلا اٹھتا تھا۔ "گدھے آئینہ سیدھا کر۔ خوش قسمتی سے تیرا آقا مصری نہیں ہے۔ ورنہ گردن اڑا دیتا۔" حجامت کے بعد اپنے آقا کو نہلاتا تھا۔ پھر اس کے ساتھ دفتر جاتا تھا۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی جدا نہیں ہوتا تھا۔"

کلیپر کہتا ہے۔

"نپولین نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی لیکن وہ اپنی فیاضی سے دوسروں کی محبت خرید لیا کرتا تھا۔ ہمیشہ جوئے میں اپنی تمام جیت رستم کو دے دیا کرتا۔ ایک مرتبہ پانچ دن کے اندر تین ہزار فرنگ رستم کو مل گئے۔ اس تقرب کی وجہ

سے تمام خادم رستم پر حسد کرنے لگے تھے۔ صرف خادم ہی نہیں بہت سے بڑے بڑے آدمی بھی جلتے تھے۔ ان کا خیال تھا۔ رستم کی یہ تمام قدردانی صرف اسی لئے ہے کہ وہ اس کے دشمنوں کو خفیہ قتل کر ڈالتا ہے۔ رستم نپولین کے ساتھ سایہ کی طرح لگا رہتا تھا۔ حتیٰ کہ فوج کی قواعد کے وقت بھی آقا کے گھوڑے کے پہلو میں اس کا عربی گھوڑا نمایاں نظر آتا تھا۔ گھوڑے پر چیتے کی کھال کا زین ہوتا تھا۔ زین پر سونے کا کام تھا۔ خود رستم کا لباس، ریشم کا کار چوبی ہوتا۔ دور دور تک اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کر دیتی تھی۔ وہ اس قدر شاندار ہوتا تھا کہ رستم عرب بادشاہ معلوم ہوتا تھا۔ اور نپولین اس کا فرنگی سپہ سالار؟ تھیٹر میں بھی وہ نپولین کے پہلو میں بیٹھتا تھا۔ تمام نظریں غلام کی شان و شوکت کے تماشہ میں محو ہو جاتی تھیں!"

جب کبھی وہ راستے میں تنہا ہوتا، مخلوق ہجوم کر کے ساتھ ہو جاتی۔ مسرت کے نعرے بلند ہونے لگتے۔ اپنے فاتح آقا کی طرح یہ غلام بھی اپنی عظمت و غرور میں مدہوش رہتا تھا۔ وہ بالکل پروا نہ کرتا تھا کہ لوگ اس کی تعریف میں نعرے لگا رہے ہیں، یا تضحیک کر رہے ہیں!

رستمی فیشن

پیرس کی نازنینوں کے لئے رستم ایک متحرک فتنہ بن گیا تھا۔ وہ ان کی نظر میں مشرقی حسن و جمال کا ایک پر اسرار پیکر تھا۔ یہاں تک کہ اس کے لباس کی بھی نقل

اتاری جانے لگی۔ پیرس کا سب سے زیادہ مقبول فیشن "رستمی فیشن" ہو گیا۔ خود جوزیفائن اس لباس پہ فخر کرتی تھی۔ فرانس سے نکل کر یہ فیشن جرمنی پہنچا اور لوئزا ملکۂ پروشیا تک نے اختیار کر لیا۔ عورتوں کی طرح مرد بھی اس کی تقلید کرنے لگے تھے۔ یہ بیماری ایسی عام ہوئی کہ خود نپولین بھی مبتلا ہو گیا۔ اس نے بھی رستم کا سا لباس اپنے لئے بنوایا تھا۔ اور بڑے بڑے جلسوں میں پہن کر جاتا تھا!

اس عہد کے ماہر مصوروں نے رستم کی تصویریں اتاریں۔ اخبارات و رسائل نے خاص اہتمام سے شائع کیں۔ پورے یورپ میں اس کی شہرت عام ہو گئی۔

جب نپولین کی تاجپوشی قریب آئی۔ تو اس نے درباری درزی کو حکم دیا۔ کہ رستم کے لئے بیش قیمت خلعت تیار کرے۔ یہ خلعت اس قدر گرانقدر تھا۔ کہ صرف کوٹ پر سات ہزار تین سو فرنک خرچ ہوئے تھے۔ جوتے کی قیمت ایک سو بیس فرنک تھی۔ یہ رقم اس زمانے میں ایک شاہی لباس ہی پر خرچ ہو سکتی تھی!

تاجپوشی کے جلوس میں رستم اپنے خاص لباس میں ملبوس شہنشاہ کے پہلو بہ پہلو چل رہا تھا۔ وہ خود بھی گھوڑے پر ایک شہنشاہ معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف اس کے اعزاز میں تالیوں کا شور بلند تھا!

منتہائے عروج

رستم نے اپنی زندگی کے بہترین ایام شہنشاہ نپولین کے زیر سایہ بسر کئے دربار میں اسے اتنا عروج حاصل تھا۔ کہ خاص و عام سب حسد کرتے تھے نپولین

جب کوئی شہر فتح کرتا تھا تو شاہی گاڑی میں فاتح کے پیچھے رستم ہی بیٹھتا تھا۔ ناواقف اسے سلطنت کا رکن اعظم خیال کرتے تھے۔ بہت سے لوگ اس کی خوشامدیں کرتے۔ تاکہ اس کے ذریعہ نپولین کی خوشنودی حاصل کریں!"

جب نپولین پیرس میں ہوتا تو رستم کو دو گھنٹے تفریح کی اجازت ملتی وہ اپنے ان دوستوں سے ملنے جایا کرتا۔ جن کے یہاں خوبصورت عورتیں ہوتیں۔ لیکن میدان جنگ میں اسے ایک لمحہ کی بھی فرصت نہیں ملتی تھی۔ کیونکہ اس کے فرائض ہر لمحہ اسے شہنشاہ کے ساتھ رہنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہی اس کے لئے کھانے کا بھی انتظام کرتا تھا۔

نپولین کے کھانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ بسا اوقات وہ کھائے بغیر ہی سو جاتا۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا۔ کہ نپولین آدھی رات کو اپنے بستر پر گیا اور کھانا طلب نہ کیا۔ رستم نے خیال کیا۔ اب وہ کھانا نہیں کھائے گا۔ اس نے بھنی ہوئی مرغی خوشی خوشی کھانا شروع کر دی۔ لیکن ابھی آدھی مرغی بھی کھانے نہیں پایا تھا۔ کہ نپولین نے کھانا مانگا۔ رستم بہت گھبرایا۔ مگر اب کر ہی کیا سکتا تھا؟ وہی بچی ہوئی مرغی لے کر حاضر ہو گیا۔ نپولین دیر تک مرغی دیکھتا رہا۔ پھر غلام پر غضبناک نظریں ڈالیں اور کہا "میں نہیں جانتا تھا کہ بعض مرغیوں کا صرف ایک ہی بازو اور ایک ہی ٹانگ ہوتی ہے۔ مجھے کبھی اس بات کا وہم بھی نہیں گزرا تھا کہ دوسروں کا جھوٹا کھانا پڑے گا۔"

رستم ڈر گیا۔ رنگ فق ہو گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا "مہربان آقا! میں

بھوکا تھا پہلے ارادہ صرف ران کھانے کا تھا۔ مگر افسوس، بازو بھی میں نے کھا لیا!" نپولین چپ ہو گیا۔ اور مرغی کھا لی۔ صبح اس نے ایک سپہ سالار کو بعض احکام دینے کے لئے طلب کیا۔ رستم بھی سامنے کھڑا تھا۔ نپولین نے سپہ سالار سے کہا۔ "تم نے کچھ سنا؟ کل رات میں نے آقائے رستم کا پس ماندہ کھایا تھا! ملعون! ادھر آ۔ میں تیرے کان ملوں گا۔ خبردار! پھر کبھی ایسی حرکت نہ کرنا۔" یہ کہہ کر نپولین ہنس پڑا۔

شادی

رستم اپنے آقا کو روز پیرس کی عورتوں سے اپنے عشقیہ معرکوں کی داستانیں سنایا کرتا تھا۔ نپولین کو ان واقعات سے بڑی دلچسپی ہوتی تھی۔ اور وہ غلام کی ہمت افزائی کیا کرتا تھا۔ آخر رستم کا یہ شوق رنگ لایا۔ اور وہ ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ اس نے شہنشاہ سے شادی کی درخواست کی نپولین نے پوچھا۔ "وہ کچھ مالدار بھی ہے؟" رستم نے جواب دیا "جب تک حضور کے قدموں سے لگا ہوں۔ مجھے مال کی کیونکر فکر ہو؟" نپولین کو یہ جواب پسند آیا۔ اور شادی کی اجازت دے دی۔

یکم فروری ۱۸۰۶ء میں الگزنڈرائن دوریل سے رستم کی شادی ہو گئی۔ خود شہنشاہ جلسہ میں شریک ہوا۔ اور تمام خرچ اپنی جیب خاص سے ادا کیا۔ شادی کے ایک برس بعد لڑکا پیدا ہوا۔ رستم نے اس کا نام ایشل رکھا۔ نپولین کو یہ بچہ بہت پیارا تھا۔ اکثر بلا کر اس سے کھیلا کرتا تھا۔ جب وہ روٹھتا تھا۔ تو اس کی دونوں

مٹھیوں میں اشرفیاں ہوتی تھیں!

نپولین کو رستم اس قدر عزیز تھا کہ سفر اٹلی کے موقعہ پر جب وہ بیمار ہوگیا۔ تو نپولین نے چلتے وقت اس سے کہا۔" رنج نہ کرنا۔ میں جلد واپس آؤں گا میری بیوی تمہاری خبر لے گی۔

خود رستم نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔ کہ شہنشاہ اس پر بے حد مہربان تھا۔ شروع میں نپولین نے اس کی کوئی تنخواہ مقرر نہیں کی تھی۔ ایک دن اتفاق سے یاد آگیا۔ تو فوراً ۱۲۰۰۰ فرنک مقرر کر دیئے۔ تھوڑی ہی مدت بعد یہ رقم دوگنی کر دی گئی یعنی ۲۴۰۰۰ فرنک ملنے لگے۔ نیز ۲۴۰۰۰ فرنک فنکار رہیں بادشاہ کی بندوق اٹھانے کے لئے اور ۹۰۰۰ فرنک دائمی انعام کے طور پر بھی ملتے تھے۔ اس کے علاوہ کھیل میں جس قدر روپیہ نپولین جیتتا تھا سب اسے دے دیتا تھا۔ عیدوں اور جشنوں کے موقع پر بھی بہت کچھ دیتا تھا۔ چنانچہ ۲۰۰۰ فرنک ۱۸۰۸ء میں دیئے۔ ۳۰۰۰ فرنک ۱۸۱۰ء میں دیئے۔ ۴۰۰۰ ۱۸۱۱ء میں دیئے۔ ۶۰۰۰ ۱۸۱۳ء میں دیئے۔ ۵۰۰۰ ۱۸۱۴ء میں دیئے۔ پھر معزولی سے پہلے ایک مرتبہ یکمشت ۵۰۰۰۰ فرنک عطا کئے!

رستم کا خاتمہ

لیکن افسوس ہے کہ مصیبت کے وقت رستم بے وفا ثابت ہوا۔ آقا کے تمام احسانات بھول کر اس سے رخ پھیر لیا۔!

۶۔ اپریل ۱۸۱۴ء میں نپولین کو تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ وہ جب

جزیرۂ البا کی طرف روانہ ہونے لگا۔ تو رستم، بلا اجازت اپنی بیوی سے مشورہ کرنے چلا گیا۔ بیوی شریف تھی۔ اس نے کہا۔ "تمہارا فرض ہے۔ کہ اس نازک وقت میں اپنے مہربان آقا کا ساتھ نہ چھوڑو۔" نپولین کو امید نہیں تھی۔ کہ رستم لوٹے گا۔ مگر دوسرے دن دیکھا تو وہ موجود تھا۔ اس نے اپنے بلا اجازت چلے جانے پر افسوس و ندامت کا اظہار کیا۔ اور نپولین کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا۔

اسی اثنا میں نپولین نے اپنی ناکامیوں سے مضطرب ہو کر زہر کھایا مگر ڈاکٹروں نے اس کی جان بچا لی۔ ایک دن اس نے رستم سے پستول طلب کیا۔ رستم نے مارشل برتیہ سے مشورہ کیا۔ مارشل نے کہا جو جی میں آئے کرو۔ میں کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ لیکن بعض دوستوں نے کہا۔ اگر شہنشاہ خودکشی کر لے گا۔ تو دنیا تمہیں کو الزام دے گی۔ کہا جائیگا۔ تم نے دشمنوں سے رشوت لے کر پستول نپولین کے حوالہ کر دیا۔ تاکہ وہ خودکشی کر لے۔

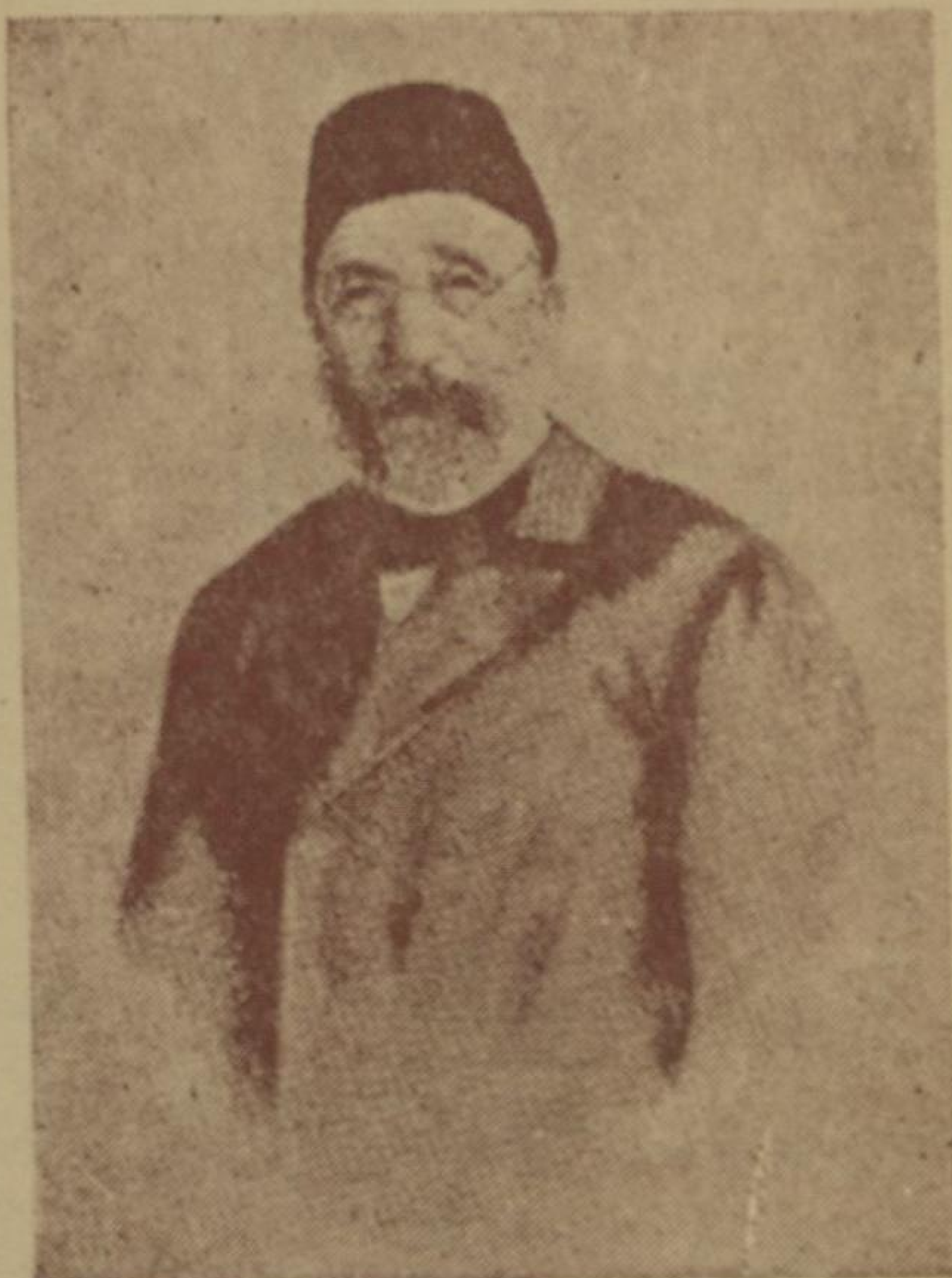
اس واقعہ کو رستم نے حیلہ بنایا۔ اور نپولین سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو گیا جلاوطن ہوتے وقت شہنشاہ نے اپنے غلام کی بابت سوال کیا۔ اور جب اس کی بے وفائی کا حال سنا تو قدرتی طور پر بہت رنجیدہ ہوا۔

رستم کی بے وفائی اسی پر ختم نہیں ہو گئی۔ بلکہ وہ دو مرتبہ انگلستان بھی گیا۔ وہاں نپولین کے دشمنوں کے سامنے اپنا شاہی خلعت پہن کر جایا کرتا تھا۔ انگریزوں کے ہاتھ اس نے اپنے آقا کی بہت سی یادگاریں بھی بیچ ڈالیں۔ انہیں میں سونے کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔ اس پر لکھا تھا۔ "نپولین کی یادگار اپنے وفادار غلام رستم کے لئے۔"

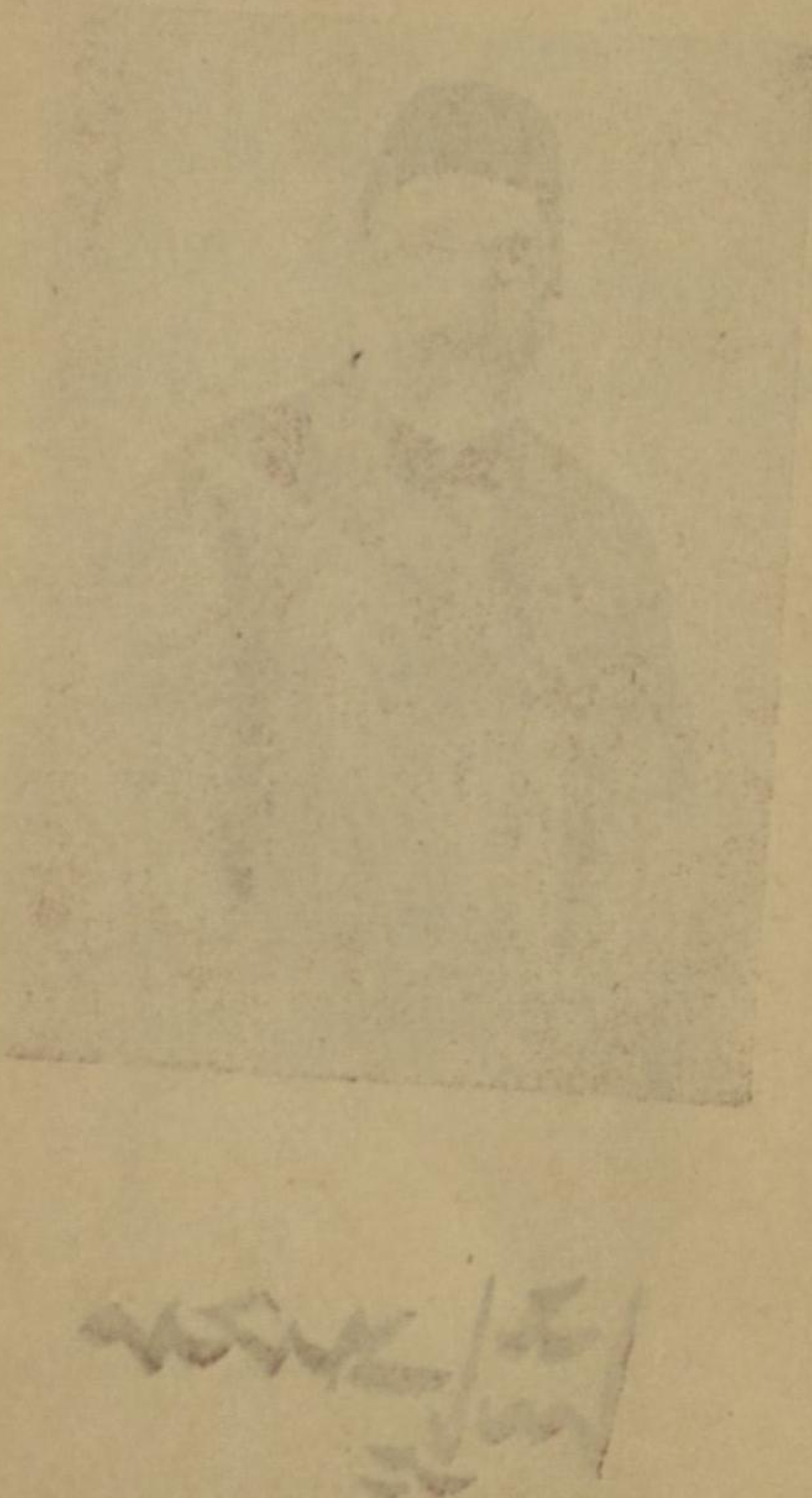
۷۔ ستمبر ۱۸۴۵ء کو اس کا انتقال ہوا۔ اس کی قبر اب تک پیرس میں موجود ہے۔ اور اس پر یہ عبارت کندہ ہے

"یہاں شہنشاہ نپولین کا غلام رستم رضا سو رہا ہے۔"

اس کی زندگی ہی میں اس کے دونوں لڑکے مر چکے تھے۔ صرف بیوہ اور ایک لڑکی باقی رہی۔ لڑکی کی شادی ایک فرانسیسی تاجر سے ہو گئی تھی۔



مدحت پاشا



مدحت پاشا

ترکی اصلاح و تجدّد کی تحریک سلطان محمود مصلح کے زمانے میں شروع ہوئی، اور سلطان عبدالعزیز کے عہد میں مصطفےٰ فاضل پاشا کے ہاتھوں اس کی پہلی جماعت کی بنیاد پڑی۔ تاہم یہ محض ابتدا تھی۔ تحریک کے قیام و ترقی کے لیے ضرورت تھی کہ کوئی ایسی اولوالعزم شخصیت نمودار ہو۔ جو اپنی قربانی کے خون سے اس نئی تخم ریزی کی آبیاری کر سکے۔ اصلاح و تغیر کی تحریک، اس آبیاری کے بغیر کبھی نشوونما نہیں پا سکتی۔

ترکی اصلاح کا پہلا فکری عنصر مصطفےٰ رشید کی شخصیت میں نمایاں ہوا تھا، لیکن اُسے سُلطان محمود اور سُلطان عبدالمجید جیسے اصلاح پسند فرمانروا ملے اور اس لیے اُس کی اصلاح پسندی آزمائش کی جگہ مزید قبولیت کا باعث ہوئی۔ فواد پاشا اور عالی پاشا بھی مصلحانہ افکار رکھتے تھے، لیکن وہ کوئی عملی قدم نہ اُٹھا سکے، اس لیے

اُن کے لیے کوئی آزمائش پیدا نہ ہو سکی۔ مصطفےٰ فاضل پاشا نے بلاشبہ نیا قدم اٹھایا اور "لائحہ اصلاحیہ" پیش کر کے اپنے لیے خطرات پیدا کر دیئے۔ تاہم معاملہ اس سے آگے نہ بڑھا کہ جلاوطن ہو گیا۔ یا مصر کی حکومت و خدیویت سے محروم ہو جانا پڑا۔ پس جہاں تک تحریک کی ابتدائی نشو و نما کا تعلق ہے، اب تک کوئی شخصیت ایسی نمایاں نہیں ہوئی تھی جسے اس راہ میں جانفروشی و قربانی کی منزل سے گزرنا پڑا ہو۔ یہ منزل ایک اولوالعزم شخصیت کے ظہور کی منتظر تھی۔ یہ اولوالعزمی مدحت پاشا کی شخصیت میں ظاہر ہو گئی۔ مدحت پاشا اس راہ کا پہلا قتیل و شہید ہے۔ اس کے خون نے وہ آبیاری بہم پہنچا دی، جس کے بغیر یہ تخمِ انقلاب بارآور نہیں ہو سکتا تھا۔

مدحت پاشا اور عبدالحمید

سلطان عبدالحمید کی پُر فریب حکمت عملیوں نے واقعات و حقائق پر ایسے پردے ڈال دیئے تھے کہ مدتوں تک دنیا کی نگاہیں دھوکہ کھاتی رہیں اور مدحت پاشا کی شخصیت نمایاں نہ ہو سکی۔ مدحت پاشا اور اس کے ساتھیوں کے خلاف جب مقدمہ قائم کیا گیا اور اسے سلطان عبدالعزیز کے قتل کی سازش کے انکشاف سے تعبیر کیا گیا تو دنیا نے بغیر کسی شک کے قبول کر لیا۔ کیونکہ نہ تو مدحت پاشا کی مصلحانہ حیثیت اور اعمال کی دنیا کو خبر تھی اور نہ ترکی میں کوئی ایسی قومی طاقت پیدا ہوئی تھی جو اصلیت کا اظہار کر سکتی۔ سر ہنری ایلیٹ (انگریزی سفیر متعینہ قسطنطنیہ) نے ۱۸۸۸ء میں جب اپنی یادداشت شائع کی اور مدحت پاشا کو بے قصور ظاہر کیا تو خود انگلستان میں بہت کم لوگوں نے اسے باور کیا۔ عام طور پر خیال کیا گیا کہ سر ہنری اپنی ذاتی دوستی کا جو اس

یں اور مدحت پاشا میں تھی، حق ادا کر رہا ہے۔ جہاں تک مشرقی اور اسلامی ممالک کا تعلق ہے۔ اُس وقت نہ تو لوگوں میں اس قسم کے معاملات سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی تھی اور نہ عام طور پر دلچسپی لی جاتی تھی۔ ہندوستان میں اس وقت جس قدر اُردو اخبار نکلتے تھے، سب نے مدحت پاشا کے مقدمہ کو "باغیوں" کے مقدمہ سے تعبیر کیا تھا۔ اس زمانے کے بعض اخبارات کے فائل ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ کلکتہ کے "اُردو گائیڈ" اور لاہور کے "انجمن پنجاب ٹئے" "باغی مدحت پاشا" کی سزایابی کی خبریں شائع کی تھیں!

مقدمہ کے بعد مدحت پاشا طائف کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ اور کچھ دنوں بعد گلا گھونٹ کر مار ڈالا گیا۔ اس وقت دنیا اِس مظلوم کو بالکل بھلا چکی تھی۔ اصلاح پسند ترکوں کے سوا جو یورپ میں منتشر ہو چکے تھے۔ کوئی جماعت ایسی نہ تھی جسے حقیقت حال کا علم ہو یا اس کی شخصیت میں دلچسپی رکھتی ہو۔

یلدز کی دعایتہ

برسوں پر برس گذر گئے اور اس قتیل ظلم و استبداد کی ہولناک موت کی حقیقت دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ رہی۔ قسطنطنیہ میں عہد حمیدی کے تمام مستبدانہ اعمال اپنی پوری سرگرمی کے ساتھ شروع ہو چکے تھے۔ مدحت پاشا اور اس کے رفقا کا نام لینا ایسا ہی ناقابلِ معافی جرم تھا جیسا "اصلاح" اور "دستور" یا "پارلمنٹ" کا نام لینا۔ کئی کتابوں کی اشاعت محض اس بنا پر صیغۂ احتساب نے (جو "نظارۂ معارف" کے نام سے قائم کیا گیا تھا)، روک دی کہ ان کے مصنفین کا نام بھی "مدحت" تھا۔

مدحت پاشا کے اعمالِ حیات کو دُنیا کی نظروں میں مذموم ثابت کرنے کے لیئے ٹرکی اور ٹرکی سے باہر بے شمار اہلِ قلم کی خدمات خرید لی گئی تھیں اور وہ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد کوئی نہ کوئی ایسی تحریر شائع کرتے رہتے تھے جس کے ذریعے مدحت اور اس کی جماعت کو ملک و سلطنت کا دشمن ثابت کیا جاتا تھا۔ اور سلطان عبدالحمید کے قاتلانہ اعمال کی مدحت سرائی کی جاتی تھی۔ قسطنطنیہ میں احمد فارس شدیاق کا عربی اخبار "الجوائب" اس کام میں سب سے زیادہ پُرجوش اور سرگرم تھا۔ اُس نے بار بار اپنے قارئین کو یقین دلانا چاہا کہ "مدحت" اور اس کی جماعت کا اصلی مقصد دینِ مقدس اسلام کی بیخ کنی کرنی تھی!" یورپ اور انگلستان میں بھی قصر یلدز کے ایجنٹ بے دریغ روپیہ خرچ کر رہے تھے۔ بہت سے اخبار اور اخبار نویس تھے جنھوں نے اپنی خدمات یلدز کے حوالہ کر دی تھیں۔ سنہ ۱۸۹۰ء میں ایک انگریزی کتاب "دوازدہ سالہ عہدِ حکومت سلطان عبدالحمید" کے نام سے انگلستان میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دیباچہ میں ظاہر کیا گیا تھا کہ "یہ انگلستان کی ایک شہزادی کی ذاتی تحقیقات کا نتیجہ ہے"۔ یہ کتاب بھی حمیدی دعایتہ (پروپیگنڈا) کا نتیجہ تھی اور اس لیئے شائع کرائی گئی تھی تاکہ سر ہنری ایلیٹ کے اُن مضامین کا جواب دے دیا جائے جو اس نے مدحت پاشا اور اُس کی مصلحانہ مساعی کی حمایت میں لکھے تھے۔ اِس کتاب کا اُردو ترجمہ ہندوستان میں شائع ہو چکا ہے۔

انکشافِ حقیقت

ایک عرصہ کے بعد جب مدحت پاشا کا لڑکا حیدر بے جوان ہُوا تو اُس کی ماں نعیمہ خانم

نے اُس کے باپ کی آخری امانت اُس کے سپرد کر دی یہ امانت کیا تھی؟ یہ ایک نامکمل خود نوشتہ سوانح حیات تھی، جو اس شہید حریت نے طائف کے قید خانے میں لکھی تھی۔ اور چند خطوط تھے جو اس کے ساتھیوں نے طائف سے بھیجے تھے۔ ان خطوط میں اُن تمام ہولناک واقعات کی تفصیل درج تھی جو طائف کے محبس میں پیش آئے تھے۔

یہ خطوط طائف کے قید خانے سے کیونکر بھیجے گئے اور کس ذریعہ سے مرحوم کے خاندان تک پہنچے؟ اس کی تفصیل ان اوراق میں درج تھی۔ اُس زمانے میں مصر کے خاندانِ خدیوی کی ایک امیر زادی، بیگم صفوت پاشا نے مکہ معظمہ میں قیام اختیار کر لیا تھا اور اپنی دولت و ریاست کی وجہ سے شریف اور گورنر حجاز پر بہت رسوخ رکھتی تھی۔ یہ بیگم مدحت پاشا اور اس کے مصلحانہ اعمال سے واقف تھی۔ اسے جب معلوم ہوا کہ وہ مع اپنے رفیقوں کے طائف میں قید کیا گیا ہے تو آمادہ ہو گئی۔ کہ اپنی موجودگی سے ان کی مصیبت کم کرنے کی کوشش کرے۔ اور تو کچھ نہ کر سکی، لیکن اس کی وجہ سے خط و کتابت کا محفوظ ذریعہ پیدا ہو گیا۔ طائف کا ایک فوجی ڈاکٹر خری بے اُس کے زیر اثر تھا۔ اُسے قیدیوں کے دیکھنے کی اجازت تھی۔ وہ ان سے پوشیدہ خطوط لے لیتا اور مکہ معظمہ پہنچا دیتا۔ مکہ سے خطوطِ مصر بھیج دیئے جاتے۔ مصر سے سمرنا کی ایک فرانسیسی کمپنی کے دفتر کا منتظم مدحت پاشا کی بیوی اور بہن تک پہنچا دیتا۔

البتہ مدحت پاشا کی خود نوشتہ سوانح عمری ناتمام تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو تکمیل کا موقعہ نہیں ملا۔ یا بقیہ مسودہ ضائع ہو گیا۔

علی حیدر بے نے ان اوراق کی مدد سے مدحت پاشا کے اعمالِ حیات پر ایک کتاب مرتب کی۔

اور ۱۹۰۶ء میں پیرس سے شائع کی۔ پہلے فرانسیسی زبان میں شائع ہوئی تھی۔ پھر اس کا انگریزی ایڈیشن بھی شائع ہو گیا۔ یہ پہلا موقعہ تھا کہ دنیا کو حقیقتِ حال سے واقف ہونے کا موقعہ ملا اور کذب و افتراء کے وہ تمام پردے چاک ہو گئے۔ جو عبدالحمید اور اُس کے حامیوں نے اس راستباز مصلح کی زندگی پر ڈال دیئے تھے۔ قصر یلدز کے کارپردازوں نے بہت کوششیں کیں کہ کسی طرح اس کتاب کی قطعی شہادتیں کمزور ثابت کر دیں۔ لیکن اب ۲۰ سال کی مستور حقیقت عالم آشکارا ہو چکی تھی اور حقیقت جب ایک مرتبہ آشکارا ہو جائے تو پھر دُنیا کی کوئی طاقت اُسے مسخر نہیں کر سکتی!

طائف کا مدفون صندُوق

۱۹۰۸ء کے انقلاب دستور کے بعد اس سلسلہ میں ایک نیا انکشاف ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہیدِ ظلم کی مقدس امانت صرف اُس کے خاندان ہی میں محفوظ نہ تھی، بلکہ طائف کی زمین نے بھی اپنا آغوشِ صیانت کھول دیا تھا تاکہ اُس کی آخری امانت اپنے سینہ میں چھپا لے اور وقتِ مناسب کی منتظر رہے۔ علی حیدر بے کو خود نوشتہ سوانح عمری کا جو مسودہ اپنی والدہ سے ملا تھا۔ وہ ناتمام تھا۔ اور کچھ پتہ نہیں چلا تھا کہ اصل میں ناتمام تھا، یا اس کے بقیہ اوراق ضائع ہو گئے تھے۔ اعلانِ دستور کے بعد یکایک یہ خبر ترکی اخبارات میں چھپی کہ وصفی آفندی مدیر اوراق دریکارڈ کیپر) طائف نے ۳۰ برس کے بعد، طائف کے ایک باغ بیرونِ شہر سے وہ آہنی صندوق نکالا ہے جس میں مدحت پاشا کی خود نوشتہ کتاب محفوظ تھی۔ وصفی آفندی نے مدحت پاشا

کے قتل کے بعد ۱۵ ذوالقعدہ ۱۳۰۲ھ کو زمین میں دفن کر دیا تھا۔"

وصفی آفندی نے یہ صندوق علی حیدر بے کے حوالہ کر دیا۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ مدحت پاشا نے اپنی کتاب مکمل کر لی تھی۔ اور "احتیاطاً" اس کی دو نقلیں بھی۔ اپنے رفیق جلیس شیخ خیراللہ آفندی (سابق شیخ الاسلام) سے کرالی تھیں۔ تاکہ اگر اصل نسخہ محفوظ نہ رہ سکے تو اس کی نقل موجود رہے۔ اصل نسخہ کا ابتدائی حصہ بدفعات سمرنا بھیج دیا گیا۔ بقیہ اجزاء ابھی نہیں بھیجے گئے تھے کہ ۱۲۔ رجب ۱۳۰۱ھ ہجری کی وہ ہولناک رات آگئی جو مرحوم اور اُس کے ساتھی محمود پاشا داماد کے قتل کی رات تھی۔ اس طرح مرحوم کو بقیہ اوراق بھیجنے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ اوراق قتل کے بعد قید خانہ کے حکام کو مل گئے تھے اور قسطنطنیہ بھیج دیئے گئے تھے لیکن ان کی دو نقلیں خیراللہ آفندی کے پاس رہ گئی تھیں۔ خیراللہ آفندی نے کوشش کی کہ کسی طرح یہ دونوں نسخے کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں۔ اُس نے ایک نسخہ اپنے معتمد دوست کمال آفندی شیخ تکیہ آستانہ تک پہنچا دینے کے لیے ایک شخص مصطفےٰ آفندی نامی کے سپرد کیا۔ اور دوسرا طائف کے ڈاکٹر فخری بے کو دے دیا۔ پہلا نسخہ کمال آفندی تک نہ پہنچ سکا اور مصطفےٰ آفندی کا انتقال ہو گیا۔ لیکن دوسرا نسخہ ڈاکٹر فخری نے وصفی آفندی مدیر اوراق طائف کے سپرد کر دیا۔ وصفی آفندی مدحت پاشا کی جماعت سے ہمدردی رکھتا تھا اور دل سے اصلاح پسند تھا۔ اس نے اس امانت کی قدر کی اور ایک آہنی صندوق میں بند کر کے شہر کے باہر دفن کر دیا۔

مدحت پاشا کی خود نوشت سوانح عمری

علی حیدر بے انقلاب کے بعد قسطنطنیہ آگیا تھا۔ اُس نے اس مسودہ کا پچھلے مسودہ

سے مقابلہ کیا اور ترکی میں ایک نئی کتاب مرتب کرکے ۱۸۰۹ء میں شائع کر دی۔ یہ مدحت پاشا کی سرگزشتِ حیات کا مکمل مجموعہ ہے۔ اس میں اس کی خود نوشتہ سوانح عمری ہے۔ قید خانۂ طائف کے تمام خطوط ہیں، اصلاح نظامِ حکومت کی تمام یادداشتیں ہیں۔ اور آخر میں چند ضمیمے ہیں۔ جن سے کتاب کے بعض تفصیل طلب مقامات کی مزید تشریح ہو جاتی ہے۔

علی حیدر بک اس مجموعہ کے دیباچہ میں لکھتا ہے:

ایک ایسے موقعہ پر جبکہ میری قوم قیامِ دستور کی یادگار منا رہی ہے۔ ۲ جولائی ۱۹۱۹ء میں اپنے والد مرحوم کی خود نوشتہ سوانح حیات کا ہدیہ اُس کے سامنے پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ یہ عبرت و موعظت کا ذریعہ ہوگا۔

جب ہمارا وطن عزیز اپنی صدہا سالہ عظمت و شوکت کی بلندیوں سے تنزّل کے قعر مذلّت میں گر رہا تھا۔ اور عدل و نظام کے فقدان نے امید و مراد کے تمام دروازے بند کر دیئے تھے تو اس وقت اِن اوراق کا مصنف ملک و ملّت کی خدمت کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنی زندگی کے کامل ۴۵ سال اس راہ میں بسر کر دیئے۔ یہاں تک کہ اسی کی راہ میں اپنی جانِ عزیز بھی قربان کر ڈالی۔

"میرے والد نے یہ اوراق قلعۂ طائف کے قید خانہ میں اُس وقت لکھے تھے، جبکہ وہ خونی مجرموں کی طرح ایک تنگ کوٹھڑی میں مقید تھا۔ اور سنتری و جانی پاسبانوں کی نگاہیں ہر وقت اُس پر لگی رہتی تھی۔ مسودہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا اکثر حصہ ایک ایک دو دو سطر کرکے مختلف اوقات میں لکھا گیا ہے۔ اور بہت سے

مقامات میں نا تمام جملوں اور لفظوں پر قلم کی کشش رک گئی ہے۔ وہ قلم اور کاغذ فرش کے نیچے چھپا کر رکھ دیا کرتے تھے اور جب کبھی پاسبانوں کی نگاہوں سے مہلت ملتی تھی۔ لکھنے میں مشغول ہو جاتے تھے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ پوری دو سطریں بھی نہ لکھ پاتے تھے کہ کسی آدمی کی آہٹ سُنائی دیتی یا باہر سے باتوں کی آواز آنے لگتی اور وہ قلم کاغذ چھپا دینے پر مجبور ہو جاتے!

"عین اُس حالت میں بھی جب کہ موت سامنے تھی، زندگی و راحت کے تمام وسائل مفقود ہو چکے تھے۔ ضعف پیری اور امراض کے آلام سے قویٰ معطل ہو رہے تھے اور ایک جابر و مستبد بادشاہ اور اس کے رذیل اور جرائم پیشہ حکام ہر آن اس کے انفاس حیات کم کرنے کے درپے ہو رہے تھے وہ اپنی قوم اور ملّت کی خدمت سے بے فکر نہیں ہوا، اور محض اس امید موہوم سے کہ شاید اُس کے لکھے ہوئے اوراق کسی وقت قوم کی نظروں تک پہنچ جائیں' اس نے اپنی زندگی کے تمام تجارب و افکار قلمبند کر دیئے۔ عین اس وقت جبکہ عبدالحمید اُس کی موت کے وسائل پر غور کر رہا تھا، وہ قید خانہ کی کوٹھڑی کے اندر اُن وسائل کے قلمبند کرنے میں مشغول تھا۔ جن کے ذریعہ عبدالحمید کا عرش مملکت موت کے خطرات سے نجات پا سکتا تھا۔

"میرے والد نے یہ کتاب قید خانہ میں لکھی، اور اس کا ایک حصّہ سمرنا میں اپنے اہل و عیال کے پاس بھجوا دیا۔ یہ ابتدائی حصّہ اور بعض خطوط مجھے اپنی والدہ مرحومہ سے ملے تھے۔ اور میں نے انہیں ایک مقدّس تذکار سمجھ کر محفوظ رکھا تھا۔ چند سال پیشتر میں نے یوروپ میں جو کتاب مرحوم کے وقائع حیات پر شائع کی تھی، وہ انہی اوراق سے مرتب

کی گئی تھی۔

یہ اُس شخص کا اثر ہے جسے ۱۲ ررجب ۱۳۰۱ھ کو رات کے ۶ بجے (یعنی انگریزی گھڑی کے حساب سے بارہ بجے)، عبدالحمید کے حکم سے قید خانہ طائف میں گلا گھونٹ کر ہلاک کر ڈالا گیا۔ اس لیے ہلاک کر ڈالا گیا، کہ وہ ظلم و استبداد کا مخالف تھا، اور عدل و دستور کا داعی تھا۔ آج جبکہ تمام مملکت عثمانیہ قیام دستور کے یادگار کی خوشیاں منا رہی ہے۔ بیجا نہیں اگر میں یہ اُمید کروں۔ کہ دستور عثمانی کے اس شہید کی یاد ہر فردِ قوم کے دل میں تازہ ہو جائے۔"

سوانح حیات

مدحت پاشا کی اسی خود نوشتہ سوانحعمری سے ہم مختصراً اس کے حالات نقل کرتے ہیں۔ اِس کے بعد اُن خطوط کا ترجمہ درج کریں گے۔ جو قلعہ طائف سے بھیجے گئے تھے۔

ابتدائی تعلیم

مدحت پاشا ابن قاضی حاجی حافظ محمدؐ اشرف۔

صفر ۱۲۳۸ھ میں بہ مقام قسطنطنیہ پیدا ہوا۔ والدین نے احمد شفیق نام رکھا تھا۔ دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اور حافظ شفیق کہلانے لگا۔
۱۲۳۹ھ میں اس کے والد علاقہ لودین کے قاضی مقرر ہو گئے۔ یہاں اس نے لکھنا سیکھا، اور ایک برس بعد جب وہ واپس ہؤا، تو عاکف پاشا وزیر خارجہ کے حکم سے

دیوانِ ہمایونی میں داخل کر لیا گیا۔ یہاں اُس نے اس رسم الخط کی مشق کی جو اس محکمہ کے لیے خاص ہے۔ اس محکمہ کی تعلیم گاہ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے تمام فارغ التحصیل طلبار کو ایک علیحدہ نام یا لقب دے دیا کرتی تھی۔ چنانچہ اس نے حافظ شفیق کے لیے بھی ایک نام تجویز کیا۔ یہ "مدحت" تھا، اُس دن سے شفیق کی جگہ "مدحت" کے نام سے پکارا جانے لگا۔

سنہ ۱۲۵۱ھ میں اس کے والد علاقہ "توفجہ کے "قاضی" مقرر ہو گئے۔ مدحت بھی ساتھ گیا۔ اور تعلیم حاصل کرتا رہا، اُس کے والد چونکہ فارغ التحصیل عالم تھے، اس لیے شروع ہی سے اسے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تعلیم دی گئی۔ توفجہ سے واپس آنے کے بعد اُس نے آستانہ کی تاریخی مسجد "جامع فاتح" میں دینی علوم کی تکمیل کی اور فارسی زبان میں بھی کامل مہارت حاصل کر لی۔

جب سنہ ۱۲۵۴ھ میں حکومت نے "مدرسۂ عرفانیہ" جاری کیا اور منتخب ہونہار طالب علم اُس میں داخل کیے گئے۔ تو اُن میں ایک "مدحت" آفندی بھی تھا۔ لیکن اُس نے جلد دیکھ لیا کہ اس مدرسہ کے طالب علم اُس کے برابر قابلیت نہیں رکھتے۔ اور تعلیم بھی بہت معمولی درجہ کی ہے۔ اِس لیے برداشتہ خاطر ہو کر چھوڑ دیا۔

عملی زندگی

سنہ ۱۲۵۶ھ میں اُس نے اپنی تعلیم ختم کر لی۔ مگر اُس کی عملی زندگی، اس سے بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھی۔ وہ کم عمری ہی سے سرکاری دفاتر میں ملازم ہو گیا تھا

دفتر کا کام بھی انجام دیتا اور تعلیم بھی جاری رکھتا۔

لیکن ۱۲۵۸ھ میں اُس نے خالص عملی زندگی میں قدم رکھا۔ ۲۵۰۰ قرش تنخواہ پر اُسے ایک مستقل جگہ مل گئی۔ یہ ولایت شام میں سرکاری کاغذات کی تحریر کی جگہ تھی دو تین برس تک اسی جگہ پر مامور رہا۔ پھر ۱۲۶۱ھ میں شامی پاشا والی قونیہ کے دفتر میں لے لیا گیا۔ ۱۲۶۳ھ میں اسی والی کے ساتھ صوبۂ قسطمونی میں گیا۔ ۱۲۶۴ھ میں قسطنطنیہ واپس آیا اور اسی زمانہ میں اُس کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد اُسے وزیر اعظم کے دفتر میں انشاء و کتابت کی معزز جگہ مل گئی۔ اِس جگہ کے مل جانے سے اُس پر اعلیٰ اور مرکزی مناصب کا دروازہ کھل گیا۔

تفتیش —— (انسپکشن)

۱۲۶۷ھ میں حلب و شام کے جنگی خانے میں سخت بدنظمی پیدا ہوئی۔ حتیٰ کہ خزانۂ حکومت کے ۲۰ تھیلے غائب ہو گئے۔ اِس معاملہ کی تفتیش کے لیے مدحت آفندی کو بھیجا گیا۔ اُسے خفیہ طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ عربی ممالک کے سپہ سالارِ اعظم محمدؐ پاشا قبرصلی کے طرزِ عمل کی بھی تحقیقات کرے۔ ۸ مہینے کی محنت کے بعد اُس نے ثابت کر دیا کہ نقدی کے ۲۰ تھیلے نہیں، بلکہ ۵ ہزار تھیلے چوری ہو گئے ہیں۔ چور کا بھی پتہ چلا لیا اور اُس سے ایک ہزار چار سو تھیلے وصول کر لیے۔ نیز ناقابلِ رد دلائل سے ثابت کر دیا کہ سپہ سالار نے قوم دروز کے معاملے میں سخت غلطیاں کی ہیں۔

مجلسِ والا کی صدارت

وزیرِ اعظم رشید پاشا نے مدحت آفندی کی اس خدمت کی بہت تعریف کی۔ عرب کا سپہ سالار معزول کر دیا گیا اور مدحت کو ۱۲۶۹ھ میں مجلس والا کا صدر مقرر کیا گیا۔ یہ منصب اُس کی فطری اور غیر معمولی انتظامی قابلیت کے ظہور کے لیے ہر طرح موزوں تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر اس کی قابلیت کے ایسے نمایاں ثبوت ملے کہ وہ رشید پاشا، عالی پاشا، رشدی پاشا وغیرہ ارکانِ سلطنت کا معتمد علیہ بن گیا۔ چنانچہ جب مسئلہ کریمیا کے حل کرنے کے لیے روسی پرنس منچیکوف قسطنطنیہ آیا، تو معاہدوں کی تحریر اسی کے سپرد کر دی گئی جو بہت بڑی ذمہ داری کا کام تھا۔

ارکانِ حکومت سے مخالفت

اب ترقی کرتے کرتے، مدحت آفندی اناطول میں کاتب ثانی کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ ۱۲۷۰ھ میں محمد پاشا قبرصلی، وزیرِ اعظم مقرر ہوا یہ مدحت آفندی کا سخت دشمن تھا۔ کیونکہ اسی نے اُسے عرب کی سپہ سالاری سے معزول کرایا تھا۔ اب اُس نے انتقام لینا اور سرکاری ملازمت سے خارج کرا دینا چاہا۔ اُس نے بہت بہت کوشش کی۔ مگر کوئی بات قابلِ گرفت نہیں ملی۔ آخر اُس نے خیال کیا، اسے صوبہ جات رومیلی کا حاکم بنا کر بھیج دیا جائے اور چونکہ سخت ہنگامے برپا تھے،

اور بہت سے والی، امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہ چکے تھے۔ اس لیے مدحت آفندی بھی ناکام رہے گا اور اس طرح اسے نالائق قرار دینے کا بہتر موقعہ نکل آئے گا۔ چنانچہ اُس نے احکام صادر کر دیئے۔

اب مدحت آفندی کے لیے سخت مشکل پیش آئی۔ وہ وزیر اعظم کی بدنیتی سے واقف ہو چکا تھا، اگر نہیں جاتا تھا تو عدول حکمی ہوتی تھی۔ جاتا تھا تو ناکامی کا اندیشہ تھا۔ بہر حال اُس نے جانے کا فیصلہ کر لیا اور ۱۲۷۱ھ میں ایک فوجی مہم ساتھ لے کر روانہ ہو گیا۔

یہاں مدحت آفندی نے حیرت انگیز قابلیت کا ثبوت دیا۔ صرف ۶ مہینے کی قلیل مدت میں ۲۸۰ باغی سرغناؤں کو گرفتار کر لیا۔ ۸ کو حکومت کی بلا اجازت پھانسی دے دی۔ ۸۰ کو آستانہ کے قید خانے میں بھیج دیا۔ باقی کو قانون کے مطابق سخت سزائیں دیں۔

باغی صوبوں نے نئے حاکم کی یہ غیر معمولی مستعدی دیکھی تو اطاعت کے لیے فوراً سر جھکا دیئے۔ یورپ کی زبان بالکل بند ہو گئی۔ جو بلقان کی اس پیچیدگی کو اپنی مداخلت کا ذریعہ بنا رکھا تھا۔ خوش قسمتی سے اب محمد پاشا بھی معزول ہو چکا تھا۔ رشید پاشا اُن کی جگہ وزیر اعظم تھا۔ اُس نے مدحت آفندی کی شاندار خدمات کا اعتراف کیا اور آستانہ واپس بُلا لیا۔ مدحت آفندی نے رُومیلی کے حالات کی مفصل روداد پیش کی اور اصلاحات کا ایک مسودہ بھی تیار کیا۔ حکومت نے اُسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا مگر بعض حالات اور تبدیلیاں ایسی پیش آگئیں کہ اصلاحات کی تجاویز

پر کوئی عملی کارروائی نہ ہو سکی۔ دراصل حکومت کا مزاج صدیوں سے ایسا ہو گیا تھا کہ بغیر کسی بنیادی تغیر کے اصلاحات کی تجاویز سودمند نہیں ہو سکتی تھیں۔

وزیر اعظم نے مدحت آفندی کو مجلس والا میں دوبارہ داخل کیا۔ مگر ابھی چند ماہ بھی اسی صورت حال پر نہیں گزرے تھے کہ رشید پاشا پھر معزول ہو گیا اور مصر چلا گیا۔ اس کی جگہ عالی پاشا کو ملی، مگر اُسے بھی یورپ کا سفر پیش آگیا اور دارالحکومت سے غیر حاضر ہو گیا۔ اس کی نیابت محمد پاشا قبرصلی کو مل گئی۔ اسی محمد شاہ کو جو مدحت کا جانی دشمن تھا۔ اُس نے برسر اقتدار آتے ہی پھر انتقامی تدابیر کا عمل میں لانا شروع کر دیا۔

اس مرتبہ مدحت پر یہ تہمت لگائی گئی کہ اُس نے حکومت کے بعض محاصل پر قبضہ کر لیا ہے۔ چنانچہ باضابطہ مقدمہ قائم ہو گیا۔ مگر پہلی ہی پیشی میں ثابت ہو گیا کہ الزام کی کوئی اصلیت نہیں۔ محض اتہام ہے۔ ایک گواہ نے تو اعلانیہ عدالت کے سامنے اقرار کر لیا۔ کہ "اسے جھوٹ بولنے پر مجبور کیا گیا ہے اور مدحت کے خلاف اُس نے جو کچھ کہا ہے، سراسر باطل ہے"۔

مدحت آفندی عزت کے ساتھ بری ہو گیا، اور نائب وزیر اعظم کو سخت شرمندگی اُٹھانی پڑی۔

بلغاریہ اور سربیہ میں

اُس زمانے میں بلغاریہ کی حالت خراب ہونے لگی۔ حکام کے ظلم نے باشندوں

کو پریشان کر ڈالا۔ مدحت آفندی تحقیقات کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے اپنی روداد باب عالی میں پیش کر دی اور ثابت کیا کہ باشندوں کی شکایتیں صحیح ہیں۔ گورنر سعید پاشا اور اُس کے آدمیوں نے سخت فساد مچا رکھا ہے۔ بابِ عالی نے اس کی روداد تسلیم کر لی اور گورنر اور اس کے عہدہ داروں کو معزول کر دیا۔

بلغاریہ سے فارغ ہو کر مدحت آفندی سرویہ گیا۔ وہاں بھی سخت ابتری پھیلی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ بعض علاقوں کے باشندوں نے ترکی حکام کو بالکل خارج کر دیا تھا۔ اور طوائف الملوکی قائم ہو گئی تھی۔ مدحت آفندی نے اس صوبے کی بھی اصلاح کی اور باغی علاقوں میں از سرِ نو حکومت قائم کر دی۔

یورپ کا سفر

مدحت آفندی قسطنطنیہ واپس آ گیا۔ اُسے یقین تھا کہ حکومت اس کی خدمات کا اعتراف کرے گی اور یہاں سلطان عبد المجید پر معزول گورنر سعید پاشا اور اُس کے دوستوں کا جادو چل چکا تھا۔ انہوں نے سلطان کو مدحت آفندی سے ناراض کرا دیا۔

اسی اثنا میں رشید پاشا کا بھی انتقال ہو گیا۔ جو مدحت کا سرپرست تھا۔ مدحت آفندی سلطان کی ناراضی سے افسردہ خاطر ہو چکا تھا۔ اپنے مربی کی وفات سے اور بھی زیادہ بے دل ہوا۔ اور سرکاری مناصب ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ ساتھ ہی اُسے خیال ہوا کہ ممالکِ یورپ کی سیر و سیاحت کرے۔ جن کی علمی و تمدنی

ترقیات کے افسانے اس کے گوش گزار ہو چکے تھے چنانچہ ۱۲۷۴ھ میں یورپ روانہ ہوگیا۔ ۶ مہینے وہاں قیام کیا۔ پیرس، لندن، وائنا اور بجیم وغیرہ کی سیر کی اور یورپ کی ترقی کے اسباب و وسائل معلوم کیے۔

فرانسیسی زبان

مدحت آفندی کی طالب علمی کے زمانے میں فرانسیسی زبان کو ٹرکی میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ اِس لیے اُسے بھی اِس طرف کوئی توجہ نہیں ہوئی۔ لیکن اب حالات میں عظیم تبدیلی واقع ہو چکی تھی اور ہر سیاسی مدبر کے لیے اس زبان سے واقفیت لازمی ہوگئی تھی۔ مدحت آفندی نے اپنے اندر یہ کمی محسوس کی اور اس زبان کی تحصیل پر کمربستہ ہوگیا۔ وہ اپنی فرصت کے اوقات میں بطور خود مطالعہ کرتا رہتا۔ یہاں تک کہ یورپ کا سفر پیش آیا اور اس زبان میں اُس نے پوری مہارت حاصل کرلی۔

رتبہ وزارت اور صوبہ کی ولایت

۱۲۷۵ھ میں مدحت آفندی یورپ سے واپس آیا اور دوبارہ مجلس والا کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا۔ اِسی اثنار میں محمدؐ پاشا قبرصلی پُرانا دشمن وزیراعظم ہو چکا تھا۔ مدحت آفندی کو خوف تھا کہ پھر اُس کی عداوت کا نشانہ بنے گا، مگر یہ دیکھ کر اُسے تعجب ہوا۔ کہ اب مخالفت کی جگہ اس کی طرف سے موافقت کے اظہارات

شروع ہو گئے تھے۔ اُس نے مدحت آفندی کو طلب کیا۔ گذشتہ معاملات کی معافی چاہی اور سلطان عبدالمجید سے بھی سفارش کی کہ اس کی پچھلی خدمات کے اعتراف میں وزارت کا اعزازی رُتبہ بخشا جائے اور صوبۂ ملش کی حکومت سپرد کر دی جائے۔ چنانچہ ۱۲۷۷ھ میں مدحت آفندی اس صوبہ کا والی مقرر ہو گیا اور سلطان عبدالمجید کی وفات تک اسی منصب پر مامور رہا۔

سلطان عبدالعزیز

سلطان عبدالعزیز کے آخری عہد میں سلطنت عثمانیہ کی حالت از حد زبوں ہو گئی۔ ہر طرف داخلی شورشیں برپا ہو گئیں اور یورپ نے متحد ہو کر از سر تو دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔

بدقسمتی سے سلطان اپنے وزیر اعظم محمود ندیم پاشا کے قبضہ میں تھے۔ اور ندیم پاشا، روسی سفیر جنرل اگنیا ٹیف کے اشاروں پر حرکت کر رہا تھا۔ ترکی قوم اس حقیقت سے واقف ہو گئی تھی اور ندیم پاشا کی معزولی کا مطالبہ کر رہی تھی۔ مگر سلطان نے کانوں میں تیل ڈال لیا تھا۔ نہ کسی کی نصیحت سُنتا تھا۔ نہ کسی فریاد پر توجہ دیتا۔

اُسی زمانے میں خبر مشہور ہوئی کہ سلطان ۴۰ لاکھ پونڈ کا ایک نیا قرضہ لینے والے ہیں عام رائے اس خبر سے نہایت برہم ہوئی۔ کیونکہ سلطان کے اسراف نے سلطنت کا تمام خزانہ خالی کر دیا تھا اور قرضوں کا ناقابل برداشت بوجھ پہلے ہی

سے ملک کی گردن توڑ رہا تھا۔

اسی اثنار میں صوبہ ہرزی گونیا کا مسئلہ پیش آیا یہ محض حکومت کی غفلت کا نتیجہ تھا۔ عام رائے اب اور بھی زیادہ برہم ہو گئی۔ چند دن بعد خبریں آنا شروع ہوئیں کہ بلقان میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور اُس کے شعلے، ادرنہ تک پہنچ گئے ہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ آستانہ میں بلقان کے مسلمان طالب علموں کے پاس خطوط پہنچے۔ کہ باغیوں نے تمہارے گھر لوٹ لیے اور عزیز و اقارب قتل کر ڈالے۔ طالب علموں نے یہ وحشت ناک خبریں سُنیں تو جوش میں آ گئے۔ ان کے جوش نے شہر کی تمام مُسلمان آبادی میں بھی ہیجان پیدا کر دیا۔ لوگوں کو پہلے سے یقین تھا کہ حکومت، بلقان کے معاملات سے غفلت برت رہی ہے اور ندیم پاشا روس کے اشارے سے یہ سب کچھ رہا ہے۔ رُوس کا مقصد یہ تھا کہ اس بہانے سے اُسے مداخلت کا موقعہ ملے۔

بلقانی طالب علموں کے ساتھ ہزاروں مخلوق باب عالی کی طرف روانہ ہوئی اور وزیر اعظم سے ملاقات کا مطالبہ کیا۔ وزیر اعظم نے یہ حالت دیکھی۔ تو ڈر گیا اور سلطان کو مشورہ دیا کہ نئی وزارت کا اعلان کر کے عوام الناس کا جوش ٹھنڈا کر دیں۔ چنانچہ محمود ندیم پاشا اور حسن آفندی شیخ الاسلام دونوں معزول کر دیئے گئے۔ رشدی پاشا وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ اور خیر اللہ آفندی شیخ الاسلام بنائے گئے۔ نیز مدحت پاشا بھی رتبۂ وزارت کے ساتھ مجلسِ اعلیٰ کا رکن مقرر ہو گیا۔

لیکن وزارت کی تبدیلی سے حالات میں کوئی اصلاح نہیں ہوئی۔ ندیم پاشا اگرچہ معزول کر دیا گیا تھا لیکن محض ایک سطحی تبدیلی تھی۔ سلطان بدستور ندیم پاشا کے ہاتھوں

میں تھا۔ ندیم پاشا روسی سفارت خانہ سے احکام حاصل کرتا اور ان کے مطابق سلطان کو مخفی مشورے دیتا رہتا۔

عام رائے نے جلد معلوم کر لیا کہ ندیم پاشا امروز فردا ہی میں پھر برسرِ حکومت آ جائے گا۔ اس کی معزولی، محض ایک دکھاوے کی کارروائی ہے۔ اسی اثناء میں رُوسی سفیر جنرل اگناٹیف نے ہر طرف مشہور کر دیا کہ دار السلطنت میں عنقریب بغاوت ہونے والی ہے۔ مسلمان عیسائیوں کے قتل کی عام تیاریاں کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اُس نے یہ بھی کیا کہ مانٹی نگرو سے ستّو مسلّح نوجوان بلائے اور اپنی سفارت کی حفاظت کے لیے مقرر کر دیے۔ اس کارروائی نے تمام شہر میں تشویش پیدا کر دی۔ قسطنطنیہ کی مسیحی آبادی نے کاروبار بند کر دیا۔ اور شہر چھوڑ دینا چاہا۔ ان کارروائیوں سے روسی سفیر کا مدعا یہ تھا کہ محمود پاشا کی دوبارہ وزارت کے لیے میدان صاف کرے وہ یہ دکھلانا چاہتا تھا کہ نئی وزارت امن و امان قائم نہیں رکھ سکتی اور مسیحی رعایا کے لیے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

ترکوں نے یہ حالت دیکھی تو وہ مرعوب نہیں ہوئے انہوں نے خود سلطان کے معزول کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ کیونکہ اب وہ سمجھ گئے تھے کہ اس شخص کی موجودگی میں کسی قسم کی اصلاح ممکن نہیں۔

یہ خبر ہوا کی طرح بازاروں میں پھیل گئی۔ وہاں سے قصرِ شاہی میں پہنچی۔ سلطان بہت پریشان ہوئے۔ والدہ سلطان نے مدحت پاشا کے پاس اپنا معتمد علیہ خواجہ سرا جوہر آغا بھیجا۔ اور دریافت کیا کہ قوم کی ناراضی دور کرنے کے لیے کونسا طریقہ مفید

ہو سکتا ہے ؟

"مدحت پاشا نے فوراً اصلاحات کا ایک مسودہ تیار کیا اور سلطان کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کیا کہ اسے جاری کر دینے سے عام رائے مطمئن ہو جائے گی مگر سلطان کی نخوت نے اُسے منظور نہ کیا۔

اِس تمام مدت میں سلطان، محمود ندیم پاشا کے مشوروں پر عمل کرتا رہا اور محمود ندیم جیسا کہ بیان ہو چکا ہے۔ روسی سفیر کی انگلیوں پر ناچ رہا تھا۔ محمود ندیم نے سلطان کو ترغیب دی کہ حسین عونی پاشا کو جلا وطن کر دیں۔ یہ روسی اثرات کا مخالف اور ایک دیانتدار شخص تھا۔ سلطان نے اُسے صوبہ بروسہ کا حاکم مقرر کر کے حکم دیا کہ پایہ تخت سے روانہ ہو جائے۔ حسین عونی بیمار تھا مگر سلطان نے اُسے جبراً بھجوا دیا۔ اسی قسم کا برتاؤ اور بہت سے مخلص اشخاص کے ساتھ بھی کیا گیا۔

کچھ مدت بعد حسین عونی پاشا بروسہ سے لوٹ آیا۔ اور دیکھا کہ عام رائے سلطان کے معزول کر دینے پر مصر ہے۔ اُس نے اس بارے میں بعض سربرآوردہ آدمیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے بالاتفاق اس تجویز کی حمایت کی۔

سلطان کی معزولی

حسین عونی پاشا، رشدی پاشا، مدحت پاشا اور خیر اللہ آفندی شیخ الاسلام نے مل کر طے کیا کہ ۹ جمادی الاوّل کو ولی عہد مراد آفندی کو تخت نشین کر دیا جائے لیکن اس تاریخ سے دو دن پہلے ہی سلطان عبدالعزیز کو کسی طرح اس معاملہ کی خبر پہنچ گئی اور انہوں نے عونی پاشا کو ملاقات کے لیے اپنے محل میں طلب کیا۔ مگر عونی پاشا نہیں

گئے۔ کیونکہ انھیں افشاء راز کا حال معلوم ہو گیا تھا۔ چونکہ اب مزید تاخیر میں خطرہ تھا۔ اس لیے یہی طے پایا کہ فوراً نئے تخت نشینی عمل میں لائی جائے۔ چنانچہ حسین عونی پاشا نے اُسی رات اپنے سرکار کی مجلس منعقد کی اور سلطان کی معزولی کے لیے بڑی تعداد میں فوج بھی طلب کر لی گئی۔

مدحت پاشا اپنی خود نوشتہ سوانح عمری میں لکھتے ہیں :-

"ہم نے مناسب سمجھا کہ ولی عہد مراد آفندی کی تخت نشینی کا اعلان وزارتِ جنگ کی عمارت میں ہو۔ چنانچہ میں (مدحت پاشا) اور رشدی پاشا صبح تڑکے وزارتِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ حسین پاشا، احمد پاشا، ردیف پاشا، حسن پاشا، طولمہ باغچہ (قصر شاہی) میں گئے تاکہ وہاں فوج کو ضروری احکام دیں۔

یہ تمام کارروائی پوری طرح مخفی رکھی گئی تھی۔ ہمیں یقین تھا کہ ہمارے رفقاء کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں ہے۔ لیکن جب ہم وزارتِ جنگ میں پہنچے تو یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ وہاں لاکھوں آدمی جمع ہیں اور نئے سلطان کے ورود کا انتظار کر رہے ہیں۔ آج تک مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ خبر تمام شہر میں راتوں رات کس طرح مشہور ہو گئی؟"

"مجمع ازحد جوش، و خروش میں تھا۔ بڑی ہی بے چینی سے مراد آفندی کا انتظار کر رہا تھا۔ اچانک ولی عہد کی سواری نمودار ہوئی۔ حسین عونی پاشا اُن کے ساتھ بیٹھے تھے۔ تمام مجمع نے نئے سلطان کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی تخت نشینی کا اعلان ہو گیا دارالخلافہ میں جشن شروع ہو گیا۔ ہر طرف جھنڈے بلند ہو گئے۔ اجنبی جہازوں نے

بھی اپنے علم اونچے کر دیئے۔ لیکن روسی سفارت خانہ نے مظاہر جشن میں کوئی حصّہ نہیں لیا اور دو دن تک عالمِ تذبذب میں رہا۔

"روس کو محمود ندیم پاشا کی معزولی سے سخت رنج ہوا تھا۔ اب خود سلطان کی معزولی نے اُسے اور بھی برہم کر دیا۔ چنانچہ زار روس نے ترکی وزارتِ خارجہ کے نام تار بھیجا۔ کہ" انہیں اس بات پر سخت افسوس ہے کہ ایک معمولی سپہ سالار کی جرات نے سلطان کو اس کے تاج و تخت سے محروم کر دیا ہے!"

"سلطان عبدالعزیز معزول کر دیئے گئے لیکن اُن کی ذات اور عزّت کو کوئی صدمہ نہیں پہنچایا گیا۔ پہلے دستور تھا کہ معزول سلاطین قید کر دیئے جاتے تھے۔ ہم بھی سلطنت کے مصالح کے لیے ایسا کر سکتے تھے۔ مگر ہم نے نہیں کیا۔ ہم جانتے تھے کہ ملک میں کوئی جماعت بھی سلطان کی طرفدار نہیں ہے۔ لہذا انہیں قید کرنا قطعاً غیر ضروری تھا۔ علاوہ بریں ہم دستوری نظام حکومت قائم کرنا چاہتے تھے اور دستوری حکومت میں کسی شخص کو بھی بغیر جرم کے قید کرنا جائز نہیں ہوتا۔ اگرچہ وہ معزول بادشاہ ہی کیوں نہ ہو"

معزول ہونے کے بعد سلطان عبدالعزیز نے سلطان مراد کو دستِ خاص سے مبارکباد کا خط لکھا اور محل طوپ قپو سے "فرعیہ" میں منتقل کر دیئے جانے کی درخواست کی۔ درخواست منظور کر لی گئی۔ اور معزول سلطان نہایت عزت و احترام کے ساتھ اپنی تین سو بیویوں اور کنیزوں کے ساتھ نئے محل میں منتقل ہو گئے۔

عبدالعزیز کی خودکشی

ہم ابھی نئے سلطان کی تاجپوشی کے جلسوں سے پوری طرح فارغ بھی نہ ہوئے

تھے کہ سلطان عبدالعزیز نے اپنی نخوت و غرور کے جنون سے بے خود ہو کر خودکشی کرلی۔

یہ واقعہ معزولی سے ۶ر دن بعد پیش آیا۔ اتوار کے دن انہوں نے اپنے ایک ملازم سے قینچی طلب کی اور اپنے بازو کی رگیں کاٹ ڈالیں۔ ان کی موت خودکشی سے ہوئی۔ یہ بالکل یقینی بات تھی۔ تاہم مزید احتیاط کے خیال سے ہم نے اس کی باقاعدہ تحقیقات بھی کرائی۔ تمام شاہی طبیبوں اور اجنبی سفارت خانوں کے ڈاکٹروں کو بلاکر معائنہ کرایا گیا۔ ان ڈاکٹروں کی تعداد ۱۹ کے قریب تھی۔ انہوں نے بالاتفاق فیصلہ کیا کہ سلطان نے خودکشی کی ہے۔

سلطان مراد کی بیماری

سُلطان مراد کی تخت نشینی ایک عظیم الشان مجمع کے سامنے عمل میں آئی تھی۔ اتنا بڑا مجمع انہوں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مجمع انتہا جوش و خروش میں تھا اور پوری قوت سے نعرے بلند کرتا تھا۔ نئے سلطان کے اعصاب پر اس منظر نے بہت بُرا اثر کیا اور وہ عصبی بیماری میں مُبتلا ہو گئے۔ اس واقعہ کے چھٹے دن جب انہوں نے معزول سلطان عبدالعزیز کی خودکشی کا حال سُنا تو مرض نے اور بھی زیادہ شدت اختیار کی۔ دوسرے ہی دن اُن میں جنون کی علامتیں ظاہر ہو گئیں۔ ہم نے یہ واقعہ احتیاطاً مخفی رکھا اور علاج کرتے رہے۔ لیکن ۲۵ دن کے بعد ایک روز سلطان باغ کے حوض میں پھاند پڑے اور محل کے خدام کو اُن کے جنون کا حال معلوم ہو گیا۔ اب اخفا نا ممکن تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں تمام شہر حقیقتِ حال سے واقف ہو گیا تھا!"

سلطان کی بیماری نے سلطنت کو سخت نقصان پہنچایا۔ ہم نے دستور اساسی تیار کر لیا تھا، مگر اسی بیماری کی وجہ سے اعلان ملتوی کر دیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ حکومت کے تمام کام معطل ہو گئے۔ حتیٰ کہ سفراء دول کے کاغذات تک کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اگرچہ وزارت و حکومت موجود تھی مگر قانون کے مطابق ہر حکم کے لیے سلطان کی منظوری لازمی تھی اور سلطان اس قابل نہ تھے کہ مُعاملاتِ سلطنت کی سماعت کر سکتے۔

ایک نئی مصیبت

اس صُورتِ حال نے ہمیں سخت پریشان کر دیا تھا۔ ہم سلطنت کے معاملات پر غور کرنے کے لیے رات رات بھر بیٹھے رہتے۔ ایک رات میرے مکان پر شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی اور وزراء سلطنت جمع تھے کہ ایک شخص حسن چرکسی نامی آیا۔ یہ فوج میں افسر تھا۔ اور سلطان عبد العزیز کے لڑکے شہزادہ یوسف عزالدین کا ایڈی کانگ رہ چکا تھا۔ اُس نے وزیر جنگ سے ایک بہت ضروری معاملہ کے لیے ملاقات کی درخواست کی۔ جوں ہی وہ اندر داخل ہُوا۔ حسین عونی پاشا پر پستول نکال کر حملہ کر دیا۔ حسینؔ عونی کے سینہ پر گولی لگی اور اُن کا کام تمام ہو گیا۔ چونکہ ہمارے پاس ہتھیار نہیں تھے، بھاگنے پر مجبُور ہو گئے۔ مگر قیصرلی احمد پاشا وزیر بحر نے قاتل کو گرفتار کرنا چاہا۔ قاتل نے انہیں بھی سخت زخمی کیا۔ وہ بھاگے۔ اُس نے تعاقب کیا۔ میرا خادم احمد آغا اُس سے لپٹ گیا۔ مگر قاتل نے

اُسے بھی قتل کر ڈالا۔ وزراء کے محافظ سپاہی دوڑے۔ مگر قاتل کی جیب میں ۵ پستول تھے۔ اُس نے ۵ آدمی اور قتل کر دیئے۔ اب کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ کہ اس کے قریب جائے۔ قاتل اب ایک دوسرے کمرے میں گھسا۔ وہاں راشد پاشا بیہوش پڑے تھے۔ اُس نے اُنہیں بھی قتل کر دیا۔ بالآخر جب کافی تعداد میں مسلح پولیس کے سپاہی پہنچے تو وہ گرفتار کیا گیا۔

اس حادثہ نے سلطنت کو بہت نقصان پہنچایا۔ حسین عونی پاشا فنون جنگ میں بے نظیر تھے۔ راشد پاشا، خارجی معاملات کے فہم میں مشہور تھے۔ ہمارے دشمن ان دونوں کی موت سے بہت خوش تھے۔

بلقان اور جزیرہ کریٹ کی شورشیں

ہم ان مصائب میں گرفتار تھے کہ مانٹی نگرو، سرویا، بلغاریہ اور کریٹ میں شورشیں برپا ہو گئیں۔ ہمارے عزم واستقلال کے لیے یہ بڑا ہی نازک وقت تھا۔ بایں ہمہ ہم نے بر وقت کارروائیوں میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔ فوراً ہر طرف فوجیں روانہ کر دی گئیں۔ ہماری فوجوں نے غیر معمولی شجاعت و ہمت دکھائی اور تمام شورشوں کا خاتمہ کر دیا۔

سلطان عبدالحمید کی تخت نشینی

لیکن سلطنت کی حفاظت کے لیے مجنون سلطان کی معزولی ناگزیر تھی اب قانون

کے بموجب عبدالحمید آفندی ولی عہد تھے۔ اس لیے وہی تخت نشین ہو سکتے تھے دستور اساسی کا جو مسودہ میں نے تیار کیا تھا، ولیعہد نے ملاحظہ کر لیا تھا اور اس سے بالکل متفق تھا۔ اُس نے بڑے ہی جوش سے کہا تھا کہ سلطنت کی نجات صرف ایسے ہی نظام حکومت سے ممکن ہے۔" اُس نے پورے یقین کے ساتھ اپنے اس عزم کا بھی یقین دلایا تھا کہ تخت نشین ہوتے ہی اُس کا اعلان کر دے گا۔ ہم خدام السلطنت کی مسرت بے حساب تھی۔ ہم برسوں سے احیاء دولت کا جو خواب خرگوش دیکھ رہے تھے۔ اب اُس کی تعبیر ہمارے سامنے تھی۔ ہم نے خیال کیا کہ یہ نوجوان شہزادہ سلطنت اور اُمت کا نجات دہندہ ثابت ہوگا۔ چنانچہ ۱۱۔ شعبان ۱۲۹۳ھ کو عبدالحمید کی تخت نشینی کا باقاعدہ اعلان کر دیا گیا۔

سفراء دول کی مؤتمر

بلقان کا مسئلہ درحقیقت رُوس کا اُٹھایا ہُوا تھا لیکن جب ہماری فوجوں نے بلقانی باغیوں کے ٹکڑے اُڑا دیئے تو رُوس نے چند نئے حیلے تراشنا شروع کئے اور دول یورپ کو ایک مؤتمر منعقد کرنے کی دعوت دی۔ چنانچہ آستانہ میں دول عظمیٰ کے ۶ سفیروں کا اجتماع ہُوا۔ انہوں نے پہلی تجویز یہ طے کی کہ بلغاریہ کو اندرونی خود مختاری دے دی جائے۔

مدحت پاشا کی وزارت

ظاہر ہے ہم اس قسم کی تجویزیں منظور نہیں کر سکتے تھے۔ ان تجویزوں کا مان لینا

بلقان سے ہاتھ دھونا تھا۔ مگر دول یورپ نے دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ رشدی پاشا وزیر اعظم بہت مخالف تھے۔ اس صورتِ حال نے مجھے مجبور کر دیا۔ کہ وزیر اعظم کی کرسی پر بیٹھ جاؤں۔ میں حالات کی ابتری سے بخوبی واقف تھا تاہم میں نے اِصلاح کی کوشش شروع کر دی۔

ہماری مصیبت صرف یورپ ہی کی جانب سے نہ تھی۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مصیبت یہ تھی کہ ہمارا خزانہ بالکل خالی تھا۔ سلطان عبدالعزیز کے مہلک اسراف نے ایک کوڑی باقی نہیں رکھی تھی۔ میں نے غیر معمولی محنت کر کے نئے بنک نوٹ جاری کر دیئے۔

دستور اساسی کا اعلان

سلطان عبدالحمید نے تخت نشین ہوتے ہی دستور اساسی کا مسودہ ایک مجلس کے سپرد کر دیا تھا کہ اُس کی جانچ پڑتال کرے۔ مجلس نے اُس پر پوری بحث کی اور منظور کر کے سلطان کی خدمت میں بھیجدیا۔ سلطان نے بھی اُس پر پسندیدگی کا اظہار کیا اور ۷ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ میں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اُس کا اعلان ہو گیا۔ تمام مملکت نے اس اعلان کا پُرجوش استقبال کیا۔ پوری سلطنت میں جشن منایا گیا۔

اِس اثناء میں ہم نے دول یورپ کی مؤتمر کو صاف اور قطعی لفظوں میں اطلاع دے دی کہ ہم اُس کی کوئی تجویز بھی منظور نہیں کریں گے۔ ہماری یہ جرأت نہایت

خطرناک تھی۔ ہم نے گویا پورے یورپ کو دعوتِ جنگ دے دی تھی مگر ہم مجبور تھے ہماری مجلس وزراء نے طے کر لیا تھا۔ کہ خاموشی سے تباہ نہیں ہوں گے۔ اگر مٹنا ہی ہے تو عزت کے ساتھ مٹیں گے۔ دول یورپ ہمارا انکار سن کر بہت برہم ہوئیں اور اپنے اپنے سفراء واپس بلا لیے۔ اس کارروائی کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے باہمی سیاسی تعلقات منقطع ہو گئے۔ مگر ہم نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

دوسری طرف میں نے یہ کیا کہ بلقانی ریاستوں سے براہِ راست گفت وشنید شروع کر دی۔ انہیں نرم گرم شرطوں پر صلح کے لیے راضی کر لیا۔ ساتھ ہی دستورِ اساسی کے اعلان کے بعد ہم نے پہلی عثمانی مجلس (پارلیمنٹ) کے لیے انتخابات شروع کر دیئے

ہم یہ سب کچھ کر رہے تھے مگر چونکہ روس کی طرف سے اعلانِ جنگ کا قوی احتمال تھا۔ اِس لیے جنگی تیاریوں سے بھی غافل نہیں تھے۔ فوجوں کی تربیت اور نقل وحمل تمام مملکت میں شروع ہو گئی تھی۔

مدحت پاشا کی جلاوطنی

سلطنت ان داخلی اور خارجی مشکلات میں پھنسی ہوئی تھی۔ میں اصلاحِ حال کی شب و روز کوشش کر رہا تھا کہ اچانک ایک دن قصرِ طوپکہ باغچہ میں سلطان نے مجھے طلب کیا۔ جوں ہی میں پہنچا۔ مجھ سے قلمدانِ وزارت لے لیا گیا اور کہا گیا کہ میں جہاز عزالدین میں فوراً سوار ہو جاؤں۔ کیونکہ میں سلطان کے حکم سے جلاوطن کر دیا گیا ہوں مجھے یورپ چلا جانا چاہیئے!

سلطان مراد کی تخت نشینی کے دن سے مَیں نے اس قدر محنت کی تھی کہ مجھے یقین ہے، کوئی دوسرا انسان نہیں کر سکتا۔ مَیں نے لگاتار جد وجہد سے اب ایسی صورتِ حال پیدا کر دی تھی کہ سلطنت تمام خطروں سے صحیح و سالم نکل جاتی۔ لیکن اب اچانک یہ معاملہ پیش آ گیا۔ پہلے مجھے خوشی ہوئی کہ اب آرام کر سکوں گا مگر فوراً اس خیال سے دل و جگر مجروح ہو گیا کہ میری زندگی میری نہیں بلکہ قوم و ملک کی ہے اور اس کے لیے سخت خطرات درپیش ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ سلطان کی یہ حرکت سلطنت کے لیے نہایت مہلک ثابت ہو گی اور اصلاح کی تمام امیدیں ضائع ہو جائیں گی۔

مَیں نے اپنا قصور دریافت کیا۔ سعید پاشا سلطان کے پاس گئے اور واپس آ کر کہا کہ دستورِ اساسی کی دفعہ ۱۱۳ کی رُو سے سلطان کو حق پہنچتا ہے کہ ہر اُس شخص کو جلا وطن کر دیں۔ جسے پولیس کا افسرِ اعلیٰ سلطنت کے لیے خطرناک ظاہر کرے۔ ساتھ ہی اُنھوں نے دو سرکاری کاغذ بھی دکھائے۔ ایک میں لکھا تھا کہ پولیس نے ایک فوجی افسر کو بازار میں کہتے سُنا ہے "مدحت پاشا عنقریب ترکی جمہوریت کا صدر منتخب ہو گا۔"

میں جلا وطنی کی اس وجہ پر اپنی بے اختیارانہ ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ سعید پاشا نے کہا "سلطان معظم، سلام کے بعد فرماتے ہیں کہ عنقریب تمھیں واپس بلا لیا جائے گا۔"

مَیں نے کہا "سلطان کے سلام کا شکریہ! مگر سلطان کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ اپنی واپسی پر مَیں ان محلوں میں سلطان کو نہیں پاؤں گا اور نہ سلطنت کی یہ عظمت و نشان نظر آئے گی۔ اُس وقت میں تباہی روک نہ سکوں گا۔" میں نے یہ کہا اور روانہ

ہو گیا۔

"میری ناگہانی جلاوطنی سے پایۂ تخت اور صوبوں میں سخت بے چینی پیدا ہوئی لوگ ڈرے کہ اب دستورِ اساسی بھی باطل ہو جائے گا۔ کیونکہ مَیں نے ہی اسے مرتب کیا تھا اور سب سے زیادہ مَیں ہی اس پر زور دے رہا تھا۔ یہ بے چینی دیکھ کر سلطان مجبور ہوئے کہ نئی نئی تہمتیں تراشی جائیں۔ چنانچہ قسطنطنیہ کے اخبارات میں شائع کیا گیا کہ میرے کاغذات میں ایسی چیزیں ملی ہیں جن سے میری خیانت ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے سلطان نے مجھے معزول کر کے جلاوطن کر دیا ہے:

اُس وقت تک تُرک اس قدر نیک دِل تھے کہ سرکاری افترا پردازیاں سمجھ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے اکثر لوگ میرے مخالف ہو گئے۔ مگر یورپ کے اخبارات حقیقتِ حال سے واقف تھے۔ انہوں نے صحیح خبر شائع کر دی کہ چونکہ مدحت پاشا نے سلطان کی غلامی منظور نہیں کی۔ اس لیے اُن پر عتاب شاہی نازل ہُوا ہے۔ ترکوں نے یہ سُنا تو سُلطان پر نہایت برہم ہوئے۔ اب قصرِ شاہی مجبور ہُوا کہ میرے خلاف ایک بڑی سازش تیار کرے۔ چنانچہ آستانہ کے اخبارات اور ساقط مقرروں اور شاعروں کو رشوت دے کر آمادہ کیا گیا کہ مجھ پر حملہ شروع کر دیں۔ میں نے ترکی اخبارات دیکھے تو ہنسنے لگا۔ کل تک یہ میرے تدبر و دیانت کے راگ گاتے تھے۔ آج مجھے شیطان قرار دینے لگے۔ اُس وقت بے اختیار میری زبان پر یہ آیت جاری ہُوئی: "واذا اراد اللہ بقوم سوءً فلا مرد لہ وما لھم من دونہ من وال"۔

روس کا اعلانِ جنگ

میری جلا وطنی کی خبر پیٹرز برگ (دارالحکومت روس) پہنچی۔ تو حکومتِ رُوس مسرت سے اُچھل پڑی۔ اب اُس نے بابِ عالی پر زور دینا شروع کیا کہ بلقان کے متعلق اُس کے مطالبات منظور کرے۔ لیکن ترکی حکومت نے انکار کیا۔ اس پر روس نے اعلانِ جنگ کر دیا اور دریائے طونہ کی طرف سے رُوسی فوج حملہ آور ہو گئی۔

اب سخت پریشانی پیدا ہو گئی۔ ہمارا خزانہ بالکل خالی پڑا تھا۔ میرے جاری کیے ہوئے بنک نوٹ سلطان نے بے پروائی سے خرچ کر ڈالے تھے۔ نئے نوٹوں کی قیمت بھی کم کر دی تھی۔ حکومت کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ رعایا سے زبردستی روپیہ وصول کیا جائے۔ چنانچہ یہی کیا گیا۔

اس سے بھی بڑی مصیبت سلطان کی ناتجربہ کاری تھی۔ جنگ شروع ہوتے ہی سُلطان نے عبدی پاشا اور ردیف پاشا کو معزول کر دیا۔ یہ دونوں سپہ سالار روسی سرحدوں سے واقف تھے اور اس جنگ کے لیے پہلے ہی سے نقشے مرتب کر چکے تھے۔ ان کی معزولی نے میدانِ جنگ میں سخت ابتری پیدا کر دی۔ اس وقت ہماری جنگی قوت کافی تھی۔ ۵ لاکھ نظامی فوج نہایت عمدہ طور پر مسلح موجود تھی۔ رضا کاروں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ مگر سلطان کی شخصی مداخلت نے معاملہ خراب کر دیا۔ رضا کار فوجیں منتشر کر دی گئیں۔ نظامی فوجوں میں بدنظمی پیدا ہو گئی اس پر بھی سلیمان پاشا نے دشمن کی یلغار روک دی اور امید بندھی کہ یہ دونوں

سپہ سالار سلطنت کو خطرہ سے بچالیں گے۔ مگر کوئی جنگی مرکز موجود نہ تھا۔ مختلف مقامات سے احکام صادر ہوتے تھے۔ ہر مقام میں سلطان کی ضد موجود تھی۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ سلیمان پاشا کی فوجیں بھاگنے لگیں۔ اور عثمان پاشا، پلونہ میں قید ہو گئے۔ پلونہ میں رُوس کی پوری قوت موجود تھی۔ خود زار روس فوج کی قیادت کر رہا تھا۔

رُوس کو کامل فتح حاصل ہو گئی۔ اور اُس کی مظفر و منصور فوجیں سین اسٹفانو د مضافات قسطنطنیہ تک پہنچ گئیں۔ دوسری طرف سے انگریزی حکومت کا جنگی بیڑہ باسفورس میں آ گیا اور قصر شاہی کے سامنے توپیں سیدھی کر کے کھڑا ہو گیا۔

مَیں اُس وقت یورپ میں اپنی جلاوطنی کے دن گزار رہا تھا۔ مجھے سلطنت کے معاملات میں مداخلت یا دُوَل یورپ سے گفت و شنید کا کوئی حق نہ تھا۔ تاہم میرا دل یہ تباہی دیکھ کر بے چین ہو گیا اور میں نے جد و جہد شروع کر دی۔ لندن پیرس وائنا، برلن تمام مراکز میں پھرا۔ اس سعی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ سین اسٹفانو کا ذلیل معاہدہ منسوخ ہو گیا۔ اور سلطنت ایک مرتبہ پھر بچ گئی۔ مجھے وزراء سلطنت اور خود سُلطان کی غفلت پر از حد افسوس ہے۔ عین اُس وقت جبکہ روس پلونہ کا محاصرہ کیے پڑا تھا۔ مَیں نے آسٹریا کو راضی کر لیا تھا کہ رُوس پر حملہ آور ہو جائے۔ آسٹریا کے حملے کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتا کہ روسی فوجوں پر واپسی کا راستہ مسدود ہو جاتا۔ اور سب کی سب یا تو قید ہو جاتیں، یا برباد ہو جائیں۔ میں نے فوراً سلطان کو مفصل تار دیا۔ مگر بیس دن گزر گئے اور کوئی جواب نہ آیا۔ اس اثنا میں رُوس کو کامل فتح حاصل ہو گئی تھی!"

میری ان خدمات کا اثر، سلطان پر پڑا۔ انہوں نے مجھ بے گناہ کو انتہائی رحم و کرم " سے معاف کر دیا۔ دو سو پونڈ ماہوار کا وظیفہ مقرر کیا۔ ایک ہزار پونڈ انعام دیا۔ ۵۰۰ پونڈ میرے بیوی بچوں کو مرحمت کیے۔ اور مجھے اجازت دی کہ اپنے خاندان کے ساتھ جزیرۂ کریٹ میں رہوں۔ چنانچہ یکم شوال ۱۲۹۵ھ میں میرا خاندان کریٹ پہنچ گیا۔

شام کی گورنری

لیکن دو ہی مہینے بعد مجھے فرمانِ شاہی ملا کہ تم شام کے گورنر مقرر کیے گئے ہو۔ میں معاملہ کی تہ تک پہنچا ہُوا تھا۔ دراصل سلطان مجھے پایۂ تخت سے دُور رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے معذرت کی۔ بڑھاپے کا عذر پیش کیا۔ مگر مسموع نہ ہوا۔ اور شام جانا پڑا۔ مجھے اس منصب سے خوشی ہوئی۔ اس لیے نہیں کہ مناصب کی طلب تھی اب میں مناصب سے اکتا سا گیا تھا۔ اس لیے کہ شام میں میں اپنا جنونِ اصلاح پورا کر سکوں گا۔ میرا جنون، میری اصلاح پسندی ہے۔ میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔

شام میں آتے ہی مَیں نے محسُوس کیا کہ مسلمان باشندوں میں تعلیم بالکل مفقود ہے۔ چنانچہ میں نے تعلیم کی اشاعت، تمام اصلاحات پر مقدّم رکھی اور سینکڑوں مدرسے جاری کر دیے۔ مَیں نے ایک قانون بنایا کہ، برس کی عمر کے بعد جو کوئی اپنے لڑکے کو مدرسے میں داخل نہیں کرے گا۔ اُسے سزا دی جائے گی۔ اِن مساعی کا نتیجہ

یہ نکلا کہ بہت جلد تعلیم کی طرف باشندوں کو رغبت پیدا ہو گئی اور ہزارہا بچے پڑھنے لکھنے لگے۔ حالانکہ مجھ سے پہلے اس صوبے میں صرف گنتی کے چند مکتب قائم تھے اور اُن میں بھی صرف قرآن پڑھایا جاتا تھا۔

از سرِ نو سازشوں کا ظہور

تعلیم کے بعد میں نے دوسری اصلاحات شروع کیں۔ مگر اچانک دارالخلافہ میں میرے خلاف از سرِ نو سازشوں کا ظہور ہو۔ سلطان نے داماد محمود پاشا اور رفندی پاشا وغیرہ کو جلا وطن کر دیا جو سعی اصلاح میں میرے ہم خیال تھے اور محمود ندیم پاشا اور جودت پاشا کو اپنا مشیر بنا لیا جو اصلاح اور اصلاح پسند جماعت کے سخت دشمن تھے۔ پارلیمنٹ بند کر دی۔ دستور اساسی منسوخ کر دیا۔ پھر خود میرے متعلق آستانہ کے اخبارات نے لکھنا شروع کیا کہ میں شام میں بغاوت کی تیاریاں کر رہا ہوں۔ عنقریب اپنی بادشاہی کا اعلان کر دوں گا۔ میں اس کی بھی پروا نہ کرتا لیکن شام میں بھی میری اصلاحات کی مخالفت پایۂ تخت سے ہونے لگی۔ اب میں نے دیکھا کہ استعفا پیش کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ چنانچہ اپنی پیری اور ضعیفی کی بنا پر استعفےٰ دے دیا۔ بڑی حجتوں کے بعد سلطان نے اُسے منظور کیا لیکن حکومت کی خدمت سے مجھے علیحدہ ہونے نہیں دیا۔ شام سے سمرنا کی گورنری پر بھیجدیا۔

اُس وقت صوبۂ سمرنا کی حالت نہایت زبوں تھی۔ کوئی انتظام نہ تھا۔ ہر طرف

لوٹ مار اور بے امنی پھیلی ہوئی تھی۔ مَیں نے از سرِ نو حکومت قائم کی۔ مدرسے جاری کیے۔ سڑکیں بنائیں۔ ٹریم جاری کی۔ مگر دارالخلافہ میں میرے خلاف برابر سازشیں جاری تھیں۔ محمود ندیم پاشا برسرِ اقتدار تھا اور روس کے اشاروں پر کام کر رہا تھا۔

اب سلطان عبدالحمید بالکل کھُل کھیلنا چاہتے تھے۔ جن جن لوگوں سے انھیں مخالفت کا ذرا بھی اندیشہ تھا۔ سب کو پایۂ تخت سے جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ مگر اس پر بھی وہ مطمئن نہ تھے۔ اس اثناء میں معزول سلطان مراد کا جنون دُور ہو چکا تھا۔ سلطان عبدالحمید کو اندیشہ پیدا ہوا۔ مُبادا انھیں دوبارہ تخت نشین کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے تمام اصلاح پسندوں کا خاتمہ کر دینا چاہا۔

مدحت پاشا کے خلاف مقدمہ

اس مقصد کے لیے سُلطان عبدالحمید نے مرحوم عبدالعزیز کی خودکشی کو آلۂ کار بنایا۔ عبدالعزیز کی وفات، ایک سازش اور قتل کا نتیجہ قرار دی گئی۔ ایک برس تک خفیہ تیاریاں ہوتی رہیں۔ پھر اچانک داماد محمود جلال الدین پاشا، رشدی پاشا سردار عبدی پاشا، رویف پاشا اور شیخ الاسلام خیر اللہ آفندی جلاوطن کر دیئے گئے۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے کہ انہی لوگوں نے سلطان عبدالعزیز کو قتل کیا ہے۔ مگر وہ تحقیقات آج تک شائع نہیں کی گئی۔

اس اثناء میں میرے بعض دوست مجھے لکھ رہے تھے کہ عنقریب تم بھی گرفتار

ہونے والے ہو۔ فوراً بھاگ جاؤ۔ نیز میرے ایک یورپین دوست نے آکر کہا۔ مَیں ایک جہاز خاص تمہارے لیے لایا ہوں۔ فوراً یورپ چلے جاؤ۔ ورنہ گرفتار ہو جاؤ گے۔ مگر مَیں نے قطعی انکار کر دیا۔ مَیں نے کہا کہ سلطان عبد العزیز نے خودکشی کی ہے۔ نہ میں نے اور نہ کسی اور نے انہیں قتل کیا ہے۔ جب مَیں مجرم ہی نہیں ہوں تو کیوں بھاگوں اور دشمنوں کو تہمت لگانے کا موقعہ دوں؟ مَیں نے ۴۰ برس سلطنت کی خدمت کی ہے۔ اب آخری وقت میں اُسے چھوڑ نہیں سکتا!

مَیں نے یہ کہا۔ حالانکہ مَیں خوب جانتا تھا کہ سلطان میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں اور جلد سے جلد میرا فیصلہ کر دینا چاہتے ہیں۔ مجھے ہر روز اپنی گرفتاری کا انتظار رہتا تھا۔ چنانچہ ۴ر مارچ کو جبکہ مَیں سمرنا کے دار الحکومت میں اپنے خاندان کے ساتھ سو رہا تھا۔ آدھی رات کے وقت مکان کا ۳ پلٹنوں نے محاصرہ کر لیا اور مجھے قید کر کے آستانہ بھیج دیا گیا۔

خطوط

"مدحت پاشا کے وہ خطوط جو اُس نے قید خانہ طائف سے اپنے عزیزوں کے نام بھیجے تھے"

(۱)

آج بچوں کی تصویریں پہنچیں۔ مَیں نے تمہارے خطوں کے جواب بھیج دیے تھے معلوم ہوتا ہے نہیں ملے۔ کیونکہ تم نے اُن کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔

سمرنا سے مجھے استانبول لے گئے۔ وہاں قصر یلدز میں مجھے اور محمود پاشا اور نوری پاشا کو علیحدہ علیحدہ حجروں میں قید کر دیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ تحقیقات سے ثابت ہو گیا ہے۔ سلطان عبدالعزیز نے خودکشی نہیں کی ہے بلکہ سلطان مراد اور اُن کی والدہ کے اشارے سے محمود پاشا اور نوری پاشا نے اُنھیں قتل کرایا ہے۔ اور یہ کہ خود میں خیراللہ آفندی اور رشدی پاشا بھی اس قاتلانہ سازش میں شریک ہیں۔ پھر کہا گیا کہ مصطفےٰ پہلوان۔ حاجی محمد مصطفےٰ جزائری۔ سلطان عبدالعزیز کے تینوں خادم اصلی قاتل ہیں۔

حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے۔ کیونکہ یہ تینوں شخص عبدالعزیز کی وفات کے وقت نظر بند تھے۔ اگر بفرضِ محال عبدالعزیز کو کسی نے قتل ہی کیا ہو تو کسی حال میں بھی میرے یا رشدی پاشا کے خلاف شبہ کرنے کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ سلطان کی وفات کے وقت اُن کی والدہ اور تین سو بیویاں اور کنیزیں محل میں موجود تھیں۔ پانچ برس گزر گئے مگر آج تک انھوں نے کبھی اشارۃً کنایتہً بھی نہیں کہا کہ سلطان قتل کیے گئے ہیں۔

میں نے محل شاہی میں نام نہاد عدالت کے سامنے پوری تفصیل سے تمام واقعات بیان کیے۔ تمام ججوں کو مجبوراً تسلیم کر لینا پڑا کہ واقعی کوئی ثبوت قتل کا موجود نہیں بلکہ یہ سراسر بہتان ہے۔ مگر چونکہ سلطان عبدالحمید "خطرناک" لوگوں سے چھٹکارا حاصل کرنے پر کمر بستہ تھے۔ اس لیے عدالت نے ۱۱۔ آدمیوں کو زبردستی مجرم قرار دے کر بے رحمانہ سزائیں دے دیں۔ عدالت کے بعض ایماندار ارکان نے آخر وقت تک اس فیصلہ میں شرکت سے انکار کیا۔ سلطان نے ان کی ایمانداری کی

بھی پوری قدر دانی کی اور ہماری طرح وہ بھی قید خانے میں بھیج دیئے گئے۔

سلطان سے میری کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ بعض مصاحب ہر تیسرے دن میرے پاس سلطانی پیغام لے کر آتے تھے اور طفل تسلیاں دے جاتے تھے۔ ایک دن یہ پیغام پہنچا کہ سلطان کو میری اس مصیبت کا نہایت قلق ہے۔ میری جلاوطنی پر وہ انتہائی افسوس کے ساتھ مجبور ہو گئے ہیں لیکن پوری ہمدردی سے مجھے اجازت دی ہے کہ اپنا خاندان اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔" نیز مجھے اذنِ شاہی حاصل ہوا کہ اپنے عزیزوں کو اگر چاہوں خط لکھ دوں۔ میں نے خطوط لکھ کر دے دیئے مگر افسوس ہے کہ وہ تم لوگوں تک نہیں پہنچائے گئے۔

مجھے یقین تھا کہ روڈس یا عکا کو جلاوطن ہو رہا ہوں۔ میرے خادم عارف کو افسروں نے جہاز کے ایک کمرے میں قید کر دیا۔ میرے پاس پہننے کا ایک کپڑا بھی نہیں تھا۔ حتیٰ کہ رات کا لباس بھی موجود نہ تھا۔ جو کپڑے میرے بدن پر تھے وہی پہنے رہا۔ اتفاق سے ایک دن میں نے خادم کو دیکھ لیا۔ اُس کے پاس میرے رات کے پہننے کا کرتا موجود تھا وہ میں نے پہن لیا۔ اور بدن کے کپڑے اُتار کر خود اپنے ہاتھ سے دھوئے اور اس وقت تک کمرے میں چھپا بیٹھا رہا۔ جب تک کپڑے سوکھ نہ گئے۔ اب دُنیا سے مجھے نفرت ہو گئی ہے اور چاہتا ہوں۔ جلد اپنے پروردگار کے سامنے پہنچ جاؤں۔

ہم تمام رفقائے مصیبت جہاز "عزالدین" پر سوار کر دیئے گئے۔ کچھ نہیں معلوم تھا۔ کہاں جا رہے ہیں؟ محمود پاشا کو ایک نہایت غلیظ کمرے میں رکھا گیا۔

نوری پاشا اور ہمیں بھی ایسے ہی کمروں میں اُتارے گئے۔ پھر دروازوں پر قفل چڑھا دیئے گئے۔

ہم جدہ پہنچے۔ بحر احمر کی گرمی بہت ہی سخت ہوتی ہے۔ ہماری تندرستی کو بہت نقصان پہنچا۔ ہمارے کمرے پائخانوں کے قریب تھے۔ بدبو سے دماغ پھٹا جاتا تھا۔ نوری پاشا تو حجاز میں ہی پاگل ہو گئے تھے۔ اب تک اُن کا دماغ درست نہیں ہُوا۔"

جدہ پہنچتے ہی ہم سمجھ گئے کہ طائف میں قید ہونا ہے۔ مگر ہم باہم کوئی گفتگو نہیں کر سکتے تھے کیونکہ ہر ایک کے ساتھ آٹھ آٹھ مسلح سپاہی تھے اور بولنے کی سخت ممانعت تھی۔ ہم سے از حد ذِلّت کا برتاؤ کیا گیا۔ کشاں کشاں مکہ معظمہ پہنچے اور حرم شریف کے قریب بعض کمروں میں قید کر دیئے گئے۔ ہم خاص مسجد کعبہ میں موجود تھے مگر ایک مرتبہ بھی ہمیں زیارت کی اجازت نہیں دی گئی۔

ہم طائف پہنچے اور قلعہ کے قید خانہ میں علیحدہ علیحدہ کوٹھڑیوں کے اندر قید کر دیئے گئے۔ ہر کمرے کے سامنے ننگی تلواریں لیے سپاہی کھڑے رہتے تھے۔ باہم گفتگو کی سخت ممانعت تھی، مگر اب اُٹھ گئی ہے کیونکہ پاسبانوں نے دیکھا، اس پابندی کی تعمیل ممکن نہیں۔

سلطان کا فرمان، شریفِ مکہ کو پہنچا کہ یہ لوگ (یعنی ہم) جلاوطن ہیں۔ اندیشہ ہے بھاگ جائیں گے۔ پوری سختی سے نگرانی ہونی چاہیئے۔ یہ حکم پاتے ہی شریف نے کمروں کے روشندانوں کو بھی بند کرا دیا اور ہمارے پیروں میں لوہے کی بیڑیاں

ڈال دیں۔ مگر اب بیڑیاں کاٹ دی گئی ہیں۔ کیونکہ بیماری نے ہمیں اس قابل ہی نہیں رکھا کہ یہ بوجھ برداشت کر سکیں۔

خوش قسمتی سے ایک شریف آدمی کی ہمدردی حاصل ہو گئی ہے۔ یہ ہمارے خطوط تم تک پہنچایا کرے گا۔ پچھلے خطوط جو تمھیں ملے، اسی کے ذریعے بھیجے گئے تھے۔ جب میں نے اپنے رفیقوں کو اطلاع دی کہ میرے اور ان کے خطوط، منزلِ مقصود پر پہنچ گئے تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے کیونکہ ہر ایک کے بچے ہیں؟ اور اُن کی ملاقات کی تمنا رکھتے ہیں۔ اگر ہم نے جرم کیا ہوتا تو اسی خیال سے دل کو تسکین دے سکتے کہ ہمارے جرم کی سزا ہے۔ لیکن ہم نے تو کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ اگر یہی جرم ہے تو افسوس اُس ملک پر جہاں اصلاح و ترقی جرم سمجھی جائے۔

میرے رفقاء انتہائی غم و الم میں ہیں۔ یہ بالکل قدرتی بات ہے۔ لیکن میری حالت اُن سے بہتر ہے۔ میں اب ۶۰ برس سے تجاوز کر چکا ہوں۔ اس عمر کا آدمی کتنے برس اور جی سکتا ہے؟ تمھیں یاد ہوگا کہ گزشتہ سال ہی سے میرا عزم تھا کہ خلوت کی زندگی اختیار کر لوں۔ سفرِ آخرت کی تیاری میں باقی دن گزار دوں۔ معلوم ہوتا ہے۔ خدا نے یہ اُسی کا سامان کر دیا ہے۔

مدت سے تمنا تھی کہ ذہن کو تلاوتِ قرآن میں مشغول کر دوں، مگر فرصت نہیں ملتی تھی۔ اب الحمد للہ پوری مہلت مل گئی اور میں نے "قد سمع اللہ" تک قرآنِ مجید از سرِ نو حفظ کر لیا ہے۔ میں نماز کی بھی پوری پابندی کرتا ہوں۔ شب و روز یادِ خدا میں مصروف رہتا ہوں۔ آیت "ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ ومن

یومن باللہ، یہد قلبہ" ہر لمحہ میرے پیش نظر رہتی ہے۔ مجھے اس سے بڑی ہی تسکین حاصل ہوتی ہے۔ اپنے رب پر متوکل ہوگیا ہوں۔ اپنے تئیں اس کے حوالے کر دیا ہے۔ تم بھی یہی کرو۔ اُس پر توکل کرو اور اُس کے سپرد ہو جاؤ۔

اگر مجھے کوئی رنج ہے تو وہ تمہاری اور بچوں کی جُدائی کا ہے۔ خداوند جل وعلا سے دُعا ہے۔ ہم سب کو پھر جمع کر دے۔ میرے مصنوعی دانت ٹوٹ گئے۔ یہاں اُن کی مرمّت کرنے والا کوئی نہیں۔ کھانے میں اب مجھے ناقابلِ برداشت تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ میں نے تمبا کو طلب کی تھی۔ ابھی تک نہیں پہنچی۔ نیز لکھا تھا کہ تفسیر بیضاوی، تفسیر رُوح البیان اور وہ زرد رنگ کی فرانسیسی کتاب بھیج دو۔ جسے میں اکثر پڑھا کرتا تھا۔ یہ سب کتابیں، ہمترنا میں موجود ہیں۔ اگر بھیج سکو تو روانگی میں دیر نہ کرنا۔

یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی کہ بچّوں کی تعلیم پر پوری توجہ صرف کر رہی ہو۔ علی حیدر، دسیمہ، صابرہ کو بہت بہت پیار کرو۔ درّیہ خانم کو اور تمام ملازموں کو سلام۔

ہمترنا میں دو صندوق، ساحلی کمپنی کے منیجر کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ان میں میرے تمغے اور اعزازی سندیں ہیں۔ تاکید کر دی تھی کہ تمھیں دے دے۔ معلوم نہیں ان کا کیا حشر ہُوا؟ اگر صندوق اب تک اسی خائن کے پاس ہیں تو مجھے لکھو۔ تاکہ اُسے یاد دہانی کردوں"

(۲)

رمضان کے بعد کوئی خط نہیں ملا۔ تمہارے اور بچوں کے حالات نہ معلوم ہونے

سے سخت قلق اور ملال ہے۔ تم نے ضرور روپیہ اور کھانے کی چیزیں بھیجی ہوں گی۔ مگر مجھے کچھ نہیں پہنچا۔ مجھے روپیہ کی از حد ضرورت ہے۔ کیونکہ پچھلے سال جو ۵۰ پونڈ بھیجے تھے اور جو رقم قسطنطنیہ سے آئی تھی۔ اب اس میں سے کچھ بھی باقی نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پہلے حکومت نے ہمارے کھانے پینے کا ذمہ خود لے رکھا تھا مگر اب وہ کسی کو کچھ نہیں دیتی۔ ہمیں اپنی روٹی خریدنا پڑتی ہے۔ ہمارے ساتھ بعض ایسے قیدی بھی ہیں جن کے پاس ایک پیسہ نہیں۔ میں اور محمود پاشا ان کی کفالت کر رہے ہیں۔ انہیں کپڑے بھی بنا دیئے ہیں۔ ہمیں قید خانے کے نوکروں کا بھی خیال کرنا پڑتا ہے۔ یہ لوگ محض ہماری وجہ سے یہاں رکھے گئے ہیں۔ ان حالات کی بنا پر ہمیں روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔

ہمارے رفقاء میں فوج کے بعض بڑے بڑے افسر بھی ہیں۔ انہوں نے ہم سے کچھ روپیہ قرض لے کر کپڑا خریدا ہے۔ بیچارے خود اپنے ہاتھ سے سی رہے ہیں۔ اُن کی مصیبت اسی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ ان کے لیے ایک خشک روٹی کا بھی انتظام نہیں کیا گیا ہے۔ بعض مجبوراً روزہ رکھتے ہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ ان کی ضروریاتِ زندگی کا حتی الوسع خیال رکھیں۔ ہر ملک میں دولت مند غریبوں کی دست گیری کرتے ہیں۔ لیکن یہاں ان مسکینوں کے لیے اس قسم کا کوئی موقعہ موجود نہیں ہے۔ انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم ہی ان کی خبر لیں۔ لہذا فوراً ۵۰ پچاس پونڈ حکومت کے توسط سے بھیج دو۔ اگر فوراً روپیہ نہ آیا تو میں اپنا پانی کا برتن اور گھڑی بیچنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ اس صورت میں لوگ بہت قیل وقال کریں گے۔

اور ہمارے ذہن کو تشویش ہو گی۔

بچوں کو پیار
مدحت
قلعہ طائف کا قید خانہ
۲۵ر اگست ۱۸۹۸ء

(۳)

"...... پرسوں یہاں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ شریف مکہ (عبدالمطلب) حسب عادت آجکل طائف میں موجود تھے۔ منگل کی رات کو وہ اپنے گھر میں مطمئن سو رہے تھے۔ کہ اچانک آدھی رات کو تین فوجوں نے آکر اُن کا محل گھیر لیا۔ فوج کے ساتھ ۴ توپیں بھی تھیں۔ صبح ہم کیا دیکھتے ہیں کہ شریف اپنے رات کے کپڑوں میں ہمارے قید خانے میں قیدی بنے چلے آرہے ہیں۔

کہا جاتا ہے۔ شریف کا جُرم یہ ہے کہ اس نے انگریزوں سے سازش کرنی چاہی تھی۔ اس شخص نے ہمیں محض سلطان کے خوش کرنے کے لیے بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ خدا نے اس کا بدلہ لے لیا۔ وہی مصیبت اس پر ڈال دی۔ جس میں ہم پھنسے ہیں۔ اس میں ہر عاقل کے لیے عبرت ہے۔ لیکن مجھے اس شخص پر بہت ترس آتا ہے۔ سو برس کا بوڑھا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت میں سے ہے۔ یہ واقعہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا ہمیں سمرنا میں پیش آیا تھا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہاں توپوں کی تعداد زیادہ تھی۔

"مدحت"

(۴)

"گذشتہ رمضان سے تمہاری اور بچوں کی کوئی خبر نہیں ملی۔ میں نے بھی تمہیں اپنی مفصل حالت نہیں لکھی۔ کیونکہ نہایت ہی سخت تکلیف میں ہوں۔ پانچ مہینے ہونے ہیں کہ ہمارے خدمت گار ہم سے علیحدہ کر دیئے گئے ہیں۔ حال میں آستانہ سے عمر بک نام ایک شخص خاص غرض سے بھیجا گیا ہے کہ اگر ہماری ایذا رسانی میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو پوری کر دے۔ اس شخص کی عمر زیادہ ہے مگر عقل کم ہے۔ اس کے افعال ایسے ہیں جو کسی شریف الطبع آدمی کے نہیں ہو سکتے۔ یہ ہماری جان لینے پر تلا ہوا ہے کیونکہ شاید اُسے یہی حکم ملا ہے یا مزید مقبولیت اس ذریعہ سے حاصل کرنی چاہتا ہے اس کا خیال ہے کہ بھوکا رکھنے سے ہم جلدی نہیں مریں گے۔ بلکہ ہماری زندگی بڑھ جائے گی۔ لہٰذا کوئی ایسی تدبیر نکالنی چاہتا ہے جس سے میری، محمود پاشا کی اور خیر اللہ آفندی کی زندگی جلد سے جلد ختم ہو جائے۔ وہ نوکروں سے کہتا ہے "تم ضرور وطن واپس جانے کے لیے بے قرار ہو گے۔ لیکن جب تک یہ تمہارے آقا زندہ ہیں تم واپس نہیں جا سکتے۔ ان کے قتل میں میری مدد کرو۔ تاکہ آزادی حاصل کر سکو۔ چنانچہ اس نے نوری پاشا کے خادم بکر آغا کو بلا کر کہا۔ "تم نوکروں کی قید اسی وقت ختم ہو گی جب یہ لوگ مریں گے۔ نوری پاشا تو مجنون ہیں۔ کئی دفعہ کمرے کی کھڑکی سے پھاندنا بھی چاہا۔ تم ان کی اس میں مدد کیوں نہیں کرتے؟ مجھ سے ریتی لو۔ اور کھڑکی کی سلاخ ریت لو۔ تاکہ نوری پاشا پھاند کر ہلاک ہو جائیں"۔

غرض کہ اُس نے تمام نوکروں کو بھڑکانا شروع کر دیا ہے۔ نوکروں نے

اُس کی سازش میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ اس پر انھیں بھی سخت تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ یہ خبریں سُن کر ہم سخت پریشان ہیں، ہمیں زہر دینے کی پوری کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک طرف دُنیادی منفعت حاصل کرنے کے لیے یہ شخص ہمیں مارنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف آخروی ثواب کے لیے حج کرنے بھی گیا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ اس طرح دین اور دُنیا دونوں اُسے حاصل ہو جائیں گے

ہم ڈیڑھ برس سے یہاں ہیں۔ مگر آج تک قلعہ کا پھاٹک تک دیکھ نہ سکے۔ عزیز ترین لوگوں سے بھی ملاقات کی اجازت نہیں ملی۔ ہمارے پاس ایک اجنبی باورچی تھا۔ ڈرا دھمکا کر اُسے بھی رُخصت کر دیا گیا۔ یہ حالات دیکھ کر ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہمیں جلد اس دُنیا سے کوچ کرنا ہو گا۔

اگر ہمارے ستانے اور اس طرح قفس میں بند رکھنے سے مقصود یہ ہے کہ قصرِ شاہی کی سازش پر پردہ ڈالا جائے تو یہ کوشش بے سُود ہے۔ یورپ بھر میں اصلی حقیقت مشہور ہو چکی ہے۔ اخبارات کے صفحوں پر آ چکی ہے۔ لیکن اگر ہمیں تکلیف دے کر سلطان اور ان کے مصاحب خوش ہوتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ احکم الحاکمین سے فریاد کریں اور دعا مانگیں کہ وہ اپنا فیصلہ جلد صادر کر دے۔ اگر تمھیں کوئی منصف مزاج ملے تو ہماری ناقابلِ بیان مصیبت کی یہ داستان سنا دینا۔

قید خانہ طائف
۵ محرم ۱۳۰۰ھ

(۵)

والیِ حجاز عثمان پاشا کے نام

"آپ نے رسالہ دار محمد بک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں شکایت کی ہے کہ میں نے عمر پاشا کے افعال کی اطلاع انگریزی قونصل کو کردی ہے حالانکہ میں نے قونصل مذکور کو ہرگز کوئی خط نہیں لکھا۔ بلکہ اس قسم کا کبھی وہم بھی پیدا نہیں ہوا۔ کہ اُسے اطلاع بھیجوں۔

عمر پاشا کی حرکتیں ایسی نہیں ہیں کہ زیادہ دنوں تک مخفی رہتیں، طائف اور مکہ میں بچہ بچہ اُن سے واقف ہے۔ اگر انگریزی قونصل کو علم ہوا ہے تو تاجروں اور عام باشندوں کے ذریعہ ہوا ہوگا۔

لیکن آپ نے دوسرے خط میں پھر مجھے اس معاملہ میں ملامت کی ہے۔ بظاہر آپ کو یقین ہے کہ اس میں میرا ہاتھ ضرور ہے لہٰذا میں مجبور ہو گیا ہوں کہ حقیقت ظاہر کر دوں۔

عمر پاشا علی الاعلان کہتے رہے ہیں کہ ان کے آنے کی غرض ہم قیدیوں کو زہر دے کر قتل کرنا ہے۔ صرف زبان ہی سے نہیں۔ بلکہ عمل سے بھی وہ اسے ثابت کرتے رہے ہیں۔ اُنھوں نے کھلے بندھوں نوکروں کو مشورہ دیا کہ اپنے آقاؤں کو دِن دہاڑے مار ڈالیں۔ نوکروں نے ایسا نہیں کیا۔ تو اُنھیں قید کر دیا گیا اور سخت تکلیفیں دی گئیں۔

اجانب کو اگر یہ خطرناک حالات معلوم ہو گئے ہیں۔ تو یہ کچھ عجیب نہیں ہے۔

انگریزی قونصلوں کا کام ہی یہ ہے کہ خبریں معلوم کر کے اپنی حکومت کو مطلع کرتے رہیں۔ باہر ہمارا کوئی ایسا معتمد علیہ موجود نہیں جس پر ہم اس طرح کے معاملات میں بھروسہ کر سکیں۔ پھر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے انگریزی قونصل کو اطلاع پہنچائی ہو گی؟ ہمارے نوکر بھی آزاد نہیں ہیں کہ اِدھر اُدھر جا سکیں۔ وہ ہفتہ میں صرف ایک مرتبہ قلعہ سے نکلتے ہیں۔ تاکہ ضروری اشیا بازار سے خرید لیں۔ اور اُس وقت بھی مسلح افسروں کی حراست میں رہتے ہیں۔

نہیں معلوم تمہارے ضمیر نے یہ کیونکر گوارا کیا۔ کہ ہمیں ملامت کرو۔ تمہارے خیال میں اُن لوگوں کا کیا حال ہو گا جو اپنی آزادی اولاد، احباب مال و متاع سب سے جیتے جی محروم کر دیئے گئے ہیں اور ایک قفس میں جانوروں کی طرح محبوس ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں کی صحت بھی معلوم نہیں کر سکتے؟ یقیناً یہ ایسا ظلم ہے۔ جسے دُنیا کا کوئی قانون، کوئی شریعت کوئی انصاف پسند انسان جائز قرار نہیں دے سکتا!

اگر یہ نئی تہمت تراشنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے عزیزوں سے خط و کتابت بھی موقوف کر دی جائے تو وہ ہماری اس قید کی وجہ سے پہلے ہی سخت بدبختی میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ مرے کو مارنا کہاں کا انصاف ہے؟

تم نے اپنے خط میں لکھا ہے کہ سمرنا میں مَیں نے فرانسیسی قونصل سے پناہ چاہی تھی۔ یہ حقیقت سے تمہاری جہالت کی دلیل ہے۔

مَیں صوبۂ سمرنا جیسے ایک بڑے صوبے کا حاکم تھا۔ اچانک ایک رات میرے

گھر کا فوجوں نے محاصرہ کر لیا۔ مجھے قید کر کے لے چلے۔ میں اپنی عورتوں اور بچوں کا گریہ و بکا اپنے کانوں سے سنتا تھا۔ مگر انھیں تسلی تک نہیں دے سکتا تھا۔ اس وقت میرے دل کی کیا حالت ہو گی؟ اس کا جواب میں خود تمہارے ضمیر سے چاہتا ہوں۔

اگر تم مجھے اس لیے ملامت کرتے ہو کہ حکومت کی حرکتوں کو حق بجانب قرار دو۔ تو یہ کوشش بے فائدہ ہے۔ میں دو مرتبہ وزیر اعظم رہ چکا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی مجھ سے یہ ذلت آمیز برتاؤ کیا گیا اور بغیر کسی جرم کے قید میں ڈال دیا گیا۔

تم نے لکھا ہے کہ تم ایسی باتوں کی اجازت دے نہیں سکتے" اور اب تم ہماری زبانیں بند کر دو گے۔ ہماری زبانیں اب بھی بند ہیں۔ معمولی افسروں اور سپاہیوں کی ہم پر حکومت ہے۔ ہم زبان ہلا نہیں سکتے۔ تم اس وقت اختیار رکھتے ہو۔ ہم بے اختیار ہیں۔ جو تمہارے دل میں آئے۔ شوق سے کرو۔ ہمیں اعتراض کا بھی حق نہیں ہے۔ تم ہمیں مجرم کہتے ہو۔ ہم اس پر بھی معترض نہیں ہو سکتے۔ لیکن میں تمہیں وہ گفتگو یاد دلاتا ہوں جو تم نے دارالحکومت میں مجھ سے کی تھی۔ تم نے انسانیت، مروّت شرافت کا ذکر کیا تھا۔ کیا یہ موجودہ برتاؤ ان صفات کے مطابق ہے؟ قید خانۂ طائف ، رصفر ۱۳۴۰ھ

(۶)

نعیمہ خانم کے نام

"..... پچھلے دنوں مشہور کر دیا گیا کہ میں ہندوستان یا یورپ بھاگ گیا

ہوں ۔ اخبارات کو یہ خبر شائع کرنے پر مجبور کیا گیا ہے۔ تعجب یہ ہے کہ فرانس کے اخبار "طان" تک کو گمراہی میں ڈال دیا گیا۔ اور اُس نے بذریعہ تار آستانہ کے اخباروں سے دریافت کیا۔ اس سے پہلے یہ افواہ مشہور کی گئی تھی کہ میں مجنوں ہو گیا ہوں ۔ معلوم نہیں کہ اس کذب و دروغ سے حکومت کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟

طائف۔

۲۳ صفر ۱۳۰۰ھ

(۷)

اپنے مرشد سلیمان آفندی کے نام

"..... قسمت میں یہی تھا کہ ہم اپنے اہل و عیال اور مال و متاع سے جیتے جی دُور اپنی آزادی سے محروم ہو جائیں ۔ ہم جس مصیبت میں گرفتار ہیں اُس کا تصوّر بھی کوئی نہیں کر سکتا ۔ صرف ذاتِ الٰہی باقی رہے گی۔ کوئی مخلوق بھی دائمی زندگی نہیں پائے گی۔ سب کے لیے زوال ضروری ہے ۔

لا یغرن امرأ عیشہ　　کل حی صائر للزوال

یہ چند روزہ زندگی ایک کھیل ہے ۔ بلکہ ایک پُل ہے جس پر سے انسان گزر جاتا ہے ۔ زندگی کی حرص و طمع لاحاصل ہے ۔ ان مصائب پر اللہ تعالیٰ بندوں کا ثواب زیادہ کر دیتا ہے ۔ ہمارے لیے انبیاء و اولیاء کا اسوۂ حسنہ موجود ہے ۔ ان میں اکثر قید خانوں ہی میں مرے ۔ امام ابو حنیفہؒ اور امام موسیٰ کاظم کی مثال ہر وقت میرے پیش نظر رہتی ہے ۔

میری حالت اس وقت یہ ہے کہ ہر لمحہ یہ مقولہ زبان پر رہتا ہے :
"کن فی الدنیا کأنک غریب" (دنیا میں اس طرح رہو گویا پردیس میں ہو۔) زندگی کے آخری مرحلے تک پہنچ چکا ہوں۔ عمر ۶۰ سے زیادہ ہوگئی ہے۔ اب مجھے ہر لمحۂ حیات غنیمت سمجھنا چاہیے اور آخرت کی تیاری کرنی چاہیے میرے پاس بعض کتابیں موجود ہیں۔ اُن میں آپ کا مجموعۂ رسائل بھی ہے۔ اس کتاب سے مجھے عبادتِ الٰہی میں بہت مدد ملتی ہے۔ لیکن انسان تنہا اپنی رائے سے ہر قسم کی ریاضت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اے شیخ جلیل! میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ میری اس راستہ کی طرف رہنمائی کیجیے جو خدا تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ میں یہاں دُور سے بھی آپ کے ہاتھ کو بوسہ دیتا ہوں۔ کیونکہ معنوی علاقہ جسمانی اتصال کا محتاج نہیں۔ آپ مجھے تحریر کے ذریعہ ہدایت دیجیے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو خود تشریف لائیے اور زبانی رہنمائی کیجیے۔ میں بے صبری سے آپ کے تحریری یا زبانی جواب کا منتظر رہوں گا۔"

قید خانہ طائف ۱۹ شوال ۱۳۰۰ھ

(۸)

نعیمہ خانم کے نام

"گزشتہ ماہ ایک خط "سعید بک" کے فرضی دستخط سے بھیج چکا ہوں۔ اس کے ایک ہفتہ بعد دو پھوڑے نکل آئے۔ ایک پیٹھ میں۔ دوسرا پہلو میں۔ یہاں صرف ایک ڈاکٹر ہے اور وہ بھی نومشق ہے۔ دوستوں کو میری بیماری سے سخت تشویش

ہوئی۔ انہوں نے میری لاعلمی میں والیٔ مکہ کو تجربہ کار طبیب بھیجنے کے لیے لکھا۔ مگر والی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں صاحبِ فراش تھا اور قصرِ سلطانی سے برابر احکام آ رہے تھے۔ کہ مجھے اور میرے رفقاء کو قتل کر ڈالا جائے۔ چنانچہ ہمارا خاص کھانا موقوف کر دیا۔ اور ہمارے نوکر بھی علیحدہ کر دیئے گئے۔ میں بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ ایک افسر نے آکر حکم پہنچایا۔ تمہیں بھی وہی کھانا ملے گا۔ جو دوسرے تمام قیدیوں کو دیا جاتا ہے۔ لہٰذا بازار سے کوئی چیز نہ خریدو۔ تمہارے خاص برتن بھی لے لیے گئے۔ قید خانے کے برتنوں میں کھاؤ۔ ہپیکپڑے بھی اپنے ہاتھ سے دھونا پڑیں گے۔" پھر اس نے ہم سے کاغذ، قلم، دوات وغیرہ لکھنے پڑھنے کا تمام سامان بھی لے لیا اور چلا گیا۔

الحمدللہ میں نے تمہارے تمام خطوط پہلے ہی سے جلا دیئے تھے۔ ورنہ انھیں ایک اور بہانہ ستانے کا مل جاتا۔ خیراللہ آفندی کی بیوی اور دو برس کی عمر کا بچہ قلعہ کے قریب ایک مکان میں تھے۔ انہیں بھی نکال دیا گیا۔ اس وقت یہ لوگ مکہ میں مقیم ہیں۔

اس سختی سے حکومت کی غرض یہ ہے کہ ہم جلد سے جلد مر جائیں۔ کیونکہ ہم لوگ اچھے کھانوں کے عادی ہیں۔ قیدیوں کا کھانا کھا کر ضرور ہلاک ہو جائیں گے۔ صرف اسی قدر نہیں۔ بلکہ ہمیں ہر ممکن تکلیف بھی دی جا رہی ہے۔ کیونکہ حکومت کو شبہ ہے کہ یہ لوگ قیدیوں کا کھانا کھانے پر بھی زیادہ دن زندہ رہیں گے۔ جب سے میرے رفقاء نے یہ حکم سنا ہے۔ نہایت پریشان ہیں اور شب و روز اللہ تعالیٰ سے دعائیں کر رہے ہیں۔

اس مہلک بیماری میں مجھے آرام کی بہت زیادہ ضرورت تھی۔ مگر میرے خادم کو بھی لے گئے۔ اسی قدر نہیں بلکہ طبیب کی آمدورفت بھی روک دی اس سے بھی بڑھ کر افسر کی گستاخانہ گفتگو نے مجھے اذیت دی۔ میری بیماری بہت زیادہ ہو گئی موت کا قطعی یقین تھا۔ دُنیا سے سفر پہ مجھے از حد خوشی تھی۔ لیکن افسوس، موت قسمت میں نہ تھی۔ زندگی کا معاملہ صرف خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ میری طلب پر بھی موت نہ آئی۔ میرے رفقاء نے ایک مرہم خود بنا کر پھوڑوں پر لگا دیا تھا۔ وہ اس سے پھوٹ گئے۔ ۱۵ دن میں زخم بھر گئے۔ اب میں پھر زندہ رہ گیا ہوں۔

افسر نے میرے خادم کو جدہ بھیج دیا تھا کہ آستانہ پہنچا دیا جائے۔ مگر قصر شاہی سے حکم آیا کہ اُسے وطن آنے نہ دیا جائے۔ بلکہ قید کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ غریب بھی قید ہے۔ اس حادثہ سے مجھے بہت رنج پہنچا۔ میں خوش تھا کہ مسکین کو اب مصیبت سے نجات ملی۔ مگر میری خوشی صرف چند روزہ تھی۔ اب مجھے اپنی مصیبت کے ساتھ اُس کی مصیبت پر بھی غم کھانا ہے۔

روپیہ، کپڑے، ماکولات، کوئی چیز بھی نہ بھیجنا کیونکہ مجھے کچھ بھی پہنچ نہیں سکتا اور اگر پہنچے بھی تو بیکار ہے۔ روپیہ اس لیے بیکار ہے کہ ہم کوئی چیز خرید نہیں سکتے۔ کپڑے اس لیے بیکار ہیں کہ کپڑے دھلوانے کی ہمیں اجازت نہیں۔ خود اپنے ہاتھوں سے دھو کر پہننا ہیں۔ اس حالت میں پرانے اور نئے کپڑے یکساں ہیں۔ لہذا کوئی چیز بھی نہ بھیجو۔

ہمارے لیے جو کھانا مقرر ہوا ہے۔ وہ صرف شوربا ہے۔ ایک ظرف میں آٹھ آدمیوں

کے لیے شوربا آتا ہے اور ہرگز کافی نہیں ہوتا۔ شام کو مولی کے پتوں کا شوربا ہوتا ہے۔ ہم لوگ یہ کھانا بالکل کھا نہیں سکتے۔ بھوکوں مر رہے ہیں۔ بہت ناتواں ہو گئے ہیں۔ ہر لحظہ موت کا انتظار رہے۔ دیکھنا چاہیئے۔ ہم میں کون پہلے قبر میں جاتا ہے۔ بچوں کو پیار۔ سب کو سلام۔ ۸۔ جمادی الآخر ۱۳۰۱ھ

(۹)

نعیمہ ہانم اور فرزند عزیز علی حیدر کے نام

یہ غالباً میرا آخری خط ہے۔ کیونکہ ہمارا کھانا بند ہو چکا ہے اور سخت تکلیفیں دی جا رہی ہیں۔ جیسا کہ پچھلے خط میں لکھ چکا ہوں۔

اب ہمیں وہ زہر دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ بلکہ کئی مرتبہ دے بھی چکے ہیں۔ لیکن میرے خادم عارف (جو اب میرے ہی ساتھ قید ہے) کی وفاداری اور بیداری کی وجہ سے اب تک انہیں کامیابی نہ ہو سکی۔ ایک دن عارف نے ایک افسر کے ذریعہ دودھ خریدا۔ افسر نے اس میں زہر ملا دیا تھا۔ عارف پہچان گیا۔ اور دودھ پھینک دیا۔ ۲ دن بعد عارف نے گوشت خرید کر میرے لیے پکایا۔ مگر اس کے ہٹتے ہی اُس میں زہر ملا دیا گیا۔ چند دن بعد ہمارے پانی کی صراحی میں زہر ملا دیا گیا۔ ہمارے محافظ بکر آفندی چرکسی نے اعتراف کر لیا ہے کہ قصرِ شاہی سے روز تاکیدی حکم آ رہے ہیں کہ ہمیں فوراً مار ڈالا جائے۔ چنانچہ عثمان پاشا والی مکہ نے محمد بک چرکسی کو مکہ معظمہ سے خاص اسی غرض سے یہاں بھیج دیا ہے۔ اور وہ قتل کی تیاریوں میں لگا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ہم

ان تمام قوتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ موت یقینی ہے۔ شائد اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی تمہیں میری موت کی خبر پہنچے۔ لیکن تم رنجیدہ نہ ہونا۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ یہ موت میرے تمام گناہوں کا کفارہ ہوگی۔ میں اپنے وطن اور امت کی راہ میں مر رہا ہوں۔ میری وصیت یہ ہے کہ حکومت کوشش کرے گی تمہیں آستانہ لے جائے اور تمہارا وظیفہ مقرر کرے۔ مگر تم اسے منظور نہ کرنا۔ اپنے گھر ہی میں رہنا میری بہن صدیقہ بانم کو اپنے ساتھ رکھنا اور ترکہ میں سے انہیں بھی حصہ دینا۔ میں نے تمہیں خدا کے سپرد کیا۔

۱۰ رجب ۱۳۰۱ھ

آخری خط

شہادت سے ایک دن پہلے لکھا گیا

علی وصفی آفندی کے نام

میں تمہیں پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں۔ اپنی سوانح عمری کا ایک جزو ختم کرکے تمہیں بھیج چکا ہوں۔ پڑھنے کے بعد سمرنا بھیج دینا۔ اب زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی کیونکہ یہ لوگ زہر دینے میں ناکام رہے۔ اب کوئی دوسری تدبیر کریں گے۔ میں ہر لمحہ خداوند تعالیٰ سے مغفرت کی دعائیں کرتا رہتا ہوں۔ اگر میں مرجاؤں تو فقراء پر دس پونڈ خیرات کر دینا جو تمہارے پاس امانت ہیں۔ اگر اس سے زیادہ خرچ کرنا تو سمرنا سے روپیہ طلب کر لینا۔ فوراً آجائے گا۔ میرے مرشد شیخ سلیمان کی

دست بوسی کرو اور میرے حق میں دعا کی درخواست کرو۔ درویش صلاح الدین پر بھروسہ نہ کرنا۔ کیونکہ اُس کی طبیعت کا حال معلوم ہے۔ بلا ضرورت مجھے نہ لکھنا۔ آئندہ شاید میں بھی کچھ نہیں لکھ سکوں گا۔ کیونکہ حالت بہت خطرناک ہوگئی ہے۔ والسلام۔

مدحت پاشا کا قتل

مدحت پاشا کے رفیق مجلس شیخ الاسلام خیراللہ آفندی نے (جو خود بھی قید خانہ طائف میں فوت ہوئے) مدحت پاشا اور داماد محمود پاشا کے ہولناک قتل کا حال اس طرح لکھا ہے:

"مدحت پاشا اور اُن کے رفقا رطائف کے قلعہ میں تین سال قید رہے۔ تیسرے سال کے آخر میں مدحت پاشا کے ایک پھوڑا نکل آیا تھا۔ فوجی ڈاکٹر کی رائے تھی کہ چاک کر دیا جائے۔ مگر بڑھاپے اور کمزوری کی وجہ سے وہ عمل جراحی پر رضامند نہ ہوتے۔ پھر یہ سبب بھی تھا کہ موصوف کو ڈاکٹر کی مہارت پر یقین نہیں تھا۔ داماد محمود پاشا نے والی حجاز کو مدحت پاشا کی لاعلمی میں تحریر کیا کہ کسی ماہرِ طبیب کا انتظام کیا جائے۔ اس کے مصارف وہ خود ادا کریں گے۔ مگر والی نے ان کی درخواست کا کوئی جواب نہیں دیا۔

مدحت پاشا نے اپنا علاج خود کیا اور زخم اچھا ہوگیا۔ سرکاری طبیب روز

معائنہ کرتا تھا۔ اور والی کو اطلاع دیتا تھا۔ والی "تار برقی کے ذریعہ روزانہ سلطان کو خبر بھیجتا تھا۔ کیونکہ سلطان کو مدحت پاشا کی موت کی جلدی تھی۔

ایک دن صوبہ دار ابراہیم آغا کے ساتھ ڈاکٹر مدحت پاشا کے کمرے میں گیا۔ اور بغیر کسی مناسبت کے کہنے لگا۔" اب یورپ میں سیاسی مدبروں کو علانیہ قتل نہیں کیا جاتا۔ جلّادوں کے بجائے یہ کام ڈاکٹر انجام دیتے ہیں۔ مجرم کی ناک پر کلوروفارم رکھ دیتے ہیں۔ جب وہ سو جاتا ہے تو گلا گھونٹ دیا جاتا ہے!" لوگوں نے طبیب کے منہ سے یہ بات سُنی مگر کوئی اس کا مطلب سمجھ نہ سکا۔

تیسری پلٹن کا کمانڈار بکر آفندی جو کسی قلعہ کے سیاسی قیدیوں کا محافظ تھا۔ چند مہینے سے وہ موجود نہ تھا۔ مکہ معظمہ میں مقیم تھا۔ مگر اچانک واپس آگیا اور سید ھا مدحت پاشا کے کمرے میں چلا گیا۔ اُس کے ساتھ ڈاکٹر اور ابراہیم آغا بھی تھے۔ لوگوں نے اُس سے اِس اچانک واپسی کی وجہ دریافت کی۔ تو کہنے لگا۔"طائف کی فوج مرتب کرنے اور طربہ کے باشندوں سے سرکاری محصول وصول کرنے آیا ہوں۔ کیونکہ کئی سال سے انہوں نے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا"۔

بکر آفندی کی واپسی کے چھٹے دن قیدی پاشاؤں کے خادم حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی مسجد میں نماز جمعہ ادا کرنے گئے۔ حسب عادت اُن کے ساتھ پہرا تھا۔ مدحت پاشا کا خادم عارف آفندی نماز کو جا نہیں سکا۔ کیونکہ اس کے آقا کی طبیعت "ناساز تھی۔ نماز کے بعد بکر آفندی کمانڈار نے تمام خادموں کو روک لیا۔ قلعہ میں واپس جانے نہیں دیا۔ نیز ایک آدمی بھیج کر عارف آغا کو بھی طلب کیا۔ مگر اس نے اپنے آقا کے

پاس سے ہٹنا منظور نہیں کیا۔ کمانڈار نے پھر آدمی بھیجا کہ عارف کو فوراً لے آؤ۔ اس مرتبہ مدحت پاشا نے قاصد سے کہا کہ کمانڈار سے کہو۔ وہ خود قلعہ میں آئے اور عارف سے جو کچھ کہنا ہے کہہ جائے۔

کمانڈار فوراً آیا اور خیر اللہ آفندی کے کمرہ میں گیا۔ اس نے خیر اللہ آفندی سے کہا:

"دار الخلافہ سے حکم آیا ہے کہ تمام نوکر چاکر سیاسی قیدیوں سے علیٰحدہ کر دیئے جائیں۔ اب انھیں حکومت کی طرف سے کوئی رقم بھی نہیں دی جائے گی۔ عام قیدیوں کا کھانا کھلایا جائے گا۔ بازار سے بھی خریدنے کی ممانعت ہے۔ قلم، دوات، کاغذ بھی رکھنے کی اجازت نہیں۔ خیر اللہ آفندی کی بیوی بھی (جو طائف میں مقیم تھیں) نکال دی جائیں گی۔"

اس خبر نے تمام قیدیوں کو سخت پریشان کیا۔ محمود پاشا غصہ ور آدمی تھے۔ انھوں نے کمانڈار کو بہت سخت سُست کہا۔ مگر بے فائدہ تھا۔ سلطانی حکم پر عمل کیا گیا۔ تمام خادم قلعہ کے باہر ایک گھر میں قید کر دیئے گئے۔ کمانڈار نے چلتے وقت کہا: وہ طائف سے باہر جا رہا ہے۔ مگر گیا نہیں۔ رات بھر قلعہ ہی میں رہا۔

مدحت پاشا دو مرتبہ وزیر اعظم بن چکے تھے اور قوم کی عظیم الشان خدمات انجام دی تھیں۔ مگر ظالموں نے نہ اُن کی خدمات کا کوئی لحاظ کیا، نہ بڑھاپے ہی پر ترس کھایا۔ انھیں بسترِ مرض پر اکیلا چھوڑ دیا۔ اُن کا خادم زبردستی لے گئے۔ اس وفادار خادم کے عوض ایک جنگلی سپاہی اُن کی تیمار داری کے لیے مقرر کر دیا۔ لیکن مدحت پاشا

کے رفقاءِ مصیبت نے اُن کی خدمت گاروں کی طرح خدمت کی۔ رات کو بھی انھیں تنہا نہیں چھوڑتے تھے۔ علی بک اُن کے ساتھ سوتے تھے۔

مدحت پاشا اپنی شجاعت اور ثابت قدمی میں مشہور ہیں۔ ان حالات نے اُن کے حوصلے کمزور نہیں کیے۔ وہ اب بھی خوش تھے۔ پابندی سے نماز پڑھتے تھے وظائف کا ورد رکھتے تھے۔ تلاوت میں مشغول رہتے تھے۔ تفسیر بیضاوی اور کتاب الشفا ان کے مُطالعہ میں رہتی تھی۔

وہ کہا کرتے تھے کہ "جو کچھ یہ لوگ کر سکتے ہیں، کر گزریں گے۔ ہم الحمد اللہ مقدس سرزمین میں موجود ہیں۔ تمام گندگیوں سے دُور ہو چکے ہیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے زیادہ سے زیادہ قتل کر سکتے ہیں۔ اور قتل ہمارے لیے دُنیا و آخرت میں عزت و سعادت کا ذریعہ ہے"۔ وہ حیرت انگیز طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات پر متوکل نظر آتے تھے

ایک دن کمانڈار آفندی نے کہا۔ وہ ۸ر مارچ کو مکہ معظمہ جائے گا۔ تاکہ خیر اللہ آفندی کی بیوی اور قیدیوں کے نوکروں کو پہنچا آئے۔ وہ مدحت پاشا کے پاس بھی گیا۔ وجہ یہ بیان کی کہ رُخصت ہونے آیا ہے مگر مقصود یہ تھا کہ اُن کی زبان سے کچھ سُنے اور چغلی کھا کر ظالموں میں مقبولیت حاصل کرے۔ مدحت پاشا نے کہا۔ میری تقریر سُنو۔ حرف بحرف، والیٔ حجاز سے کہہ دینا:

کہنا عبد الحمید نے تمھیں بڑا منصب بخشا ہے۔ مدحت پاشا کی خدمات آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ آج اُس کی جو حالت ہے دیکھ رہے ہو۔ یہ سُلطان، اسی طرح اپنے خیر خواہوں کی خدمات پر انعام دیا کرتا ہے۔ مدحت پاشا کو معلوم ہے۔ کہ

سُلطان اس کے قتل پر تُلا ہُوا ہے۔ تمہیں اس کام پر مقرر کیا ہے۔ اس وقت تمہاری جتنی خاطر و مدارت ہے، صرف اسی مطلب سے ہے۔ اس کے بعد تمہارا جو حال ہوگا وہ دُوسروں کی حالت سے معلوم کر سکتے ہو۔ سروری آفندی نے ہمیں سزا دی تھی۔ اس پر سلطان نے خوش ہو کر اُسے "قاضی عسکر" کا عہدہ دیا۔ مگر اب سروری آفندی کی حالت کیا ہے؟ اس وقت وہ مگنیسا میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ جو دت پاشا ہمارے گرانے میں سلطان کا دست و بازو تھا۔ مگر آج اس کی حالت کیا ہے؟ اس وقت وہ خود اپنے گھر میں قید ہے۔ اور ذلت کی زندگی بسر کر رہا ہے! ان معاملات پر غور کرو۔ کیونکہ اس سلطان کی طبیعت ہی ایسی ہے تم مسلمان ہو۔ قرآن پڑھو۔ قرآن میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "ومن یقتل مومناً متعمداً فجزاؤہ جہنم خالداً فیہا وغضب اللہ ولعنہ واعد لہ عذاباً عظیماً! (جو کوئی جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کرے، اُس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اُس پر خدا کا غضب ہو گا۔ خدا کی لعنت ہوگی اور اُس کے لیے بہت بڑا عذاب تیار ہے!) اس کے بعد مدحت پاشا نے اس آیت کی تفسیر بیان کی اور کہا:

دیکھو حضرت حسن بن علی علیہ السلام بھی بعض بادشاہوں کے اشارے سے قتل کیے گئے تھے۔ قیامت تک دُنیا اُن کے قاتلوں پر لعنت کرتی رہے گی۔ خُدا انہیں دوزخ میں ڈالے گا۔ تم والی سے میری تقریر حرف بحرف کہہ دینا۔"

اس پر بکر آفندی نے کہا:

"جناب عالی! مَیں بہت سی لڑائیوں میں شریک ہُوا ہُوں مگر میدانِ جنگ

کے باہر آج تک ایک مرغی بھی اپنے ہاتھ سے نہیں ماری۔ میں ہرگز کوئی جرم نہیں کر سکوں گا۔"

سات دن بعد بکر آفندی واپس آیا۔ اُس کے ساتھ قیدیوں کے نوکر بھی تھے۔ اُس نے مدحت پاشا سے کہا۔ سلطان کا حکم آیا ہے کہ نوکر قیدیوں کے پاس واپس کر دیئے جائیں۔ انھیں ہر طرح آرام دیا جائے۔ والی حجاز نے سلام کے بعد معذرت کی ہے کہ میرا قصور نہیں۔ میں نوکر ہوں۔ آقا کے حکم کی اطاعت کرتا ہوں۔"

اس درمیان میں مدحت پاشا کی صحت اچھی ہو گئی۔ تقریباً شفا حاصل ہو گئی تھی۔ ایک دن مدحت پاشا نے ایک سپاہی سے دُودھ منگایا۔ ایک افسر نوری آفندی تلوار لے کر اُس کے ساتھ ہو گیا اور بڑی مستعدی سے دودھ لے آیا۔ لوگوں کو اس نئی بات پر بہت تعجب ہوا۔ یہ شخص کبھی قیدیوں سے اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ آج کیوں اس قدر مہربان ہو گیا؛ سید بک، مدحت پاشا کے کھانے کی روز جانچ کر لیا کرتے تھے۔ انھوں نے پتیلی کھولی۔ تو دُودھ کا رنگ اچھا نہ تھا۔ ایک چمچہ لے کر انھوں نے اپنی زبان پر رکھا۔ تمام مُنہ کڑوا ہو گیا۔ دوسرے قیدیوں کو چکھایا۔ سب نے یہی محسُوس کیا۔ جنھوں نے ایک دو قطرے بھی نگل لیے تھے وہ بیہوش ہو گئے اور کئی ہفتے بیمار پڑے رہے۔

مدحت پاشا کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے محمد آغا کو بُلا کر انجان بن کر کہا:

"دُودھ والے نے ہمیں دہی دُودھ بھیجا تھا۔ جس میں سے کما نذار کو دیا گیا ہے

لیکن جس نے بھی دُودھ کا ایک قطرہ زبان پر رکھا، اس کا حلق جل گیا۔ معلوم ہوتا ہے زہر، تانبے کے کساؤ سے پیدا ہو گیا ہے۔ تم ابھی جا کر کمانڈار کو خبر کر دو۔ ایسا نہ ہو کہ اُنھیں کوئی نقصان پہنچ جائے۔"

محمد آغا نے واپس آ کر کہا۔ کمانڈار ابھی دودھ والے کے برتنوں کا معائنہ کریں گے۔ اُسے ماریں گے۔ قید کر دیں گے۔ پوری تحقیقات کریں گے۔ قیدیوں نے یہ سُنا تو مُسکرانے لگے۔ کیونکہ سُن چکے تھے کہ کمانڈار اپنے ساتھیوں سے پُوچھتا تھا: "ان لوگوں نے دُودھ تو پی لیا ہو گا؟ کیا مر گئے؟ کیا زہر کا اثر فوراً ظاہر ہوتا ہے؟"

مدحت پاشا کے بعض رفقاء نے مسموم دودھ کمانڈار کے پاس بھیجدیا کہ اس کی کیمیاوی تحلیل کی جائے۔ لیکن اُس نے ہنس کر دودھ واپس کر دیا اور کہا۔ یہاں تحلیل کرنے کے آلات موجود نہیں!"

اس واقعہ کے بعد باورچی خانہ اچھی طرح بند کر دیا جاتا تھا۔ کھانے پینے کے برتنوں پر علامتیں لگا دی جاتی تھیں۔ لیکن دو ہفتہ کے بعد ایک دن عارف آغا نے جونہی دروازہ کھولا۔ برتنوں پر سے علامتیں ہٹی ہوئی تھیں۔ باسی کھانے کا رنگ بدلا ہُوا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہو گیا کہ زہر ملا دیا گیا ہے۔ بعد میں ممش آغا اور نوری آفندی نے اقرار کیا کہ انھوں نے زہر ملایا تھا!"

اسی اثناء میں محمود پاشا، دست وقے میں مبتلا ہو گئے۔ پتہ چلا۔ قہوہ میں کوئی زہریلا مادہ ملا ہوا ہے۔ انھوں نے قہوہ پینا چھوڑ دیا۔ اور اچھے ہو گئے۔

ایک دن پانی کا رنگ اور مزہ بدلا ہوا تھا۔ اس میں زہریلا مادہ ملا دیا گیا تھا۔

فوراً صراحی توڑ ڈالی گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ زہر، مصر سے مہیا کیا جاتا تھا۔ لانے والا ایک شخص اسمٰعیل آغا تھا۔ والی حجاز کو اس پر بہت اعتماد تھا اور اسی کے ذریعہ دشمنوں کو قتل کرایا تھا۔ یہ ایک مدت سے یہاں آیا ہوا تھا۔ مگر تنہا اس خطرناک جرم کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ۳۱۔ مارچ ۱۳۰۱ھ کو رسالدار محمد لطفی دو رجمنٹ فوج اور توپ خانہ لے کر مکہ معظمہ سے آیا اور قلعہ کے محافظوں میں اپنے بہ سپاہی داخل کر دیئے۔

محمد لطفی نے آتے ہی مدحت پاشا کے خادم عارف آغا کو طلب کر کے کہا۔ "میں زہر لایا ہوں۔ اگر تم مدحت پاشا کو کھلا دو۔ تو تمھیں ایک ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔ ایک دوسرا شخص، محمود پاشا کو مارنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ اُسے ۶۰۰ ہزار پونڈ انعام دیا جائے گا۔"

عارف آغا بہت وفادار نوکر تھا اُس نے بظاہر زہر لے لیا اور وعدہ کیا کہ اپنے آقا کو قتل کر ڈالے گا۔ مگر قلعہ میں واپس آ کر مدحت پاشا اور محمود پاشا کو پورا قصہ سُنا دیا۔ انھوں نے باقی رفقاء کو مطلع کیا۔ سب نہایت پریشانی میں پڑ گئے۔

محمد لطفی، خاص قتل کے ارادے سے آیا تھا۔ تمام قیدی اس حقیقت سے واقف ہو چکے تھے۔ اپنی آمد کے ایک ہفتہ بعد اس نے ارتکابِ جرم کی پھر کوشش کی۔ پورے قلعے میں فوج لا کر بھر دی اور محاصرہ کر لیا۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ کیونکہ مدحت پاشا کے خادم عارف آغا نے بڑی ہی وفاداری سے کام لیا تھا۔ اور راز فاش کر دیا تھا

واقعہ یہ ہوا کہ صوبہ دار ابراہیم نے عارف آغا کو کئی دوسرے افسروں کی موجودگی میں بلا کر کہا :

"ہم آج رات مدحت پاشا کا خاتمہ کر دینا چاہتے ہیں۔ اب سے پہلے تم زہر لے گئے۔ اور پکا وعدہ کیا مگر اب تک کچھ بھی نہیں کیا۔ لہٰذا اب یہ کرو۔ کہ تم مدحت پاشا کے ساتھ سوتے ہو۔ رات کو کمرے کا دروازہ کھلا رہنے دینا۔ دیکھو اگر دروازہ بند کر کے سو گئے تو ہم سے بڑا کوئی نہ ہوگا!"

یہاں قلعہ میں سیاسی قیدی نماز عشاء کے بعد اپنے اپنے کمروں میں جانے کے لیے رخصت ہو رہے تھے کہ عارف آغا نے آ کر کہا :

"آپ لوگ جُدا نہ ہوں، کیونکہ آج رات میرے آقا کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔"

تمام رفقاء گھبرا گئے اور انھوں نے طے کر لیا کہ مدحت پاشا کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ ایک افسر نے عارف آغا کی گفتگو سُن لی تھی۔ اُس نے محمد لطفی کو خبر پہنچائی۔ محمد لطفی نے فوراً عارف آغا کی گرفتاری اور قیدیوں کے منتشر کرنے کا حکم دے دیا۔ مثلاً ایک افسر نے آ کر کہا "میرالائی محمد لطفی سلام کے بعد کہتے ہیں کہ آپ لوگوں کا یکجا رہنا ممنوع ہے۔ فوراً اپنے اپنے کمروں میں چلے جائیے۔"

مدحت پاشا اور محمود پاشا نے جواب دیا۔ "ہم ہرگز یہاں سے نہیں جائیں گے تم تلوار کے زور سے ہمیں نکال دو!"

پھر فوراً بکر آفندی کمانڈر نے آ کر کہا۔ "عارف، ایک شریر آدمی ہے۔ وہ ایک ایسا جھوٹ بولا ہے۔ جسے پورے سمندر کا پانی بھی دھو نہیں سکتا۔"

مدحت پاشا نے پوچھا: "ہمارے گرد یہ تمام تیاریاں کیسی ہیں؟"
بکر آفندی نے جواب دیا: "ہمیں اب تک کوئی خاص حکم نہیں ملا ہے۔ لیکن ہر حکم کی اطاعت ضرور کریں گے۔"
پھر اُس نے قسم کھائی کہ اب تک جتنی خبریں مشہور ہوئی ہیں، بالکل جھوٹ ہیں اور قلعہ سے باہر چلا گیا۔

جرم کی رات

۱۲۔ رجب سنہ ۱۳۰۱ھ کو رات کے پچھلے پہر میں مدحت پاشا اور داماد محمود پاشا قتل کر ڈالے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

اس رات میرالائی محمد لطفی اور بکر آفندی کمانڈار قلعہ کے پھاٹک میں رہے۔ قلعہ کے اندر بہت سی فوج جمع کر دی گئی۔ سپاہیوں کو کافی مقدار میں کارتوس تقسیم کر دیے گئے۔ آدھی رات کے بعد محمود پاشا کے خادم حاجی شکری کو جگا کر پکڑ لے گئے۔ پھر ہر قیدی کے کمرے کے سامنے دو دو مسلح سپاہی کھڑے کر دیے گئے۔ مدحت پاشا کا خادم عارف آغا پہلے ہی سے قید کر دیا گیا تھا۔ مگر موصوف تنہا نہ تھے۔ نامق پاشا کے لڑکے علی بک ان کے ساتھ سو رہے تھے۔

اچانک مدحت پاشا کے کمرے کا دروازہ توڑ ڈالا گیا۔ علی بک کو اُٹھا لے گئے اور مدحت پاشا کو قتل کرنا چاہا۔ انھوں نے کوئی مقابلہ نہیں کیا۔ صرف خدا کے خوف سے ڈرایا اور نصیحت کی۔ اُنھوں نے کہا: "دیکھو، سپاہی کا کام، وطن کی حفاظت

ہے۔ نہ کہ ارتکابِ جرم۔" لیکن ان کا گلا گھونٹ ڈالا اور وہ ہلاک ہو گئے۔

اسی طرح قاتلوں نے محمودؔ پاشا کا دروازہ بھی توڑا۔ وہ جاگ پڑے اور تکیہ اٹھا کر دیر تک مقابلہ کرتے رہے۔ آخر تھک گئے۔ محمدؔ آغا، ایک افسر نے اُن کے گلے میں رسی کا پھندا ڈال دیا۔ وُہ زور سے چلّائے، "امان اللہ" ۔ اس آواز پر سب لوگ جاگ پڑے۔

خیر اللہ آفندی پاس کے کمرے میں تھے۔ وہ بھی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ سپاہیوں نے کہا۔ "ڈریے نہیں۔ آپ کے لیے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔" مگر وہ اِس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ بیہوش ہو کر گر پڑے اور رات بھر اسی حالت میں رہے۔

محمودؔ پاشا کو قتل سے پہلے بہت تکلیف دی گئی۔ پھر گلا گھونٹ ڈالا گیا۔ مگر یہ ناکافی سمجھا گیا اور لاٹھیوں سے ان کا ہاتھ توڑ ڈالا گیا!"

قتل کے بعد دونوں شہیدوں کو غسل خانے اُٹھالے گئے۔ رات ہی کو علی بگ بروسہ لی کی دُکان توڑ کر کفن کے لیے کپڑا نکالا گیا اور فوج کے امام یونس آفندی کو شہیدوں کے نہلانے کا حکم دیا گیا۔ مگر انھوں نے انکار کیا۔ اس پر دونوں کو بغیر غسل اور کفن کے دفن کر دیا گیا۔ دونوں قبروں پر دو پتھر لگا دیئے گئے۔ ایک پر لکھا تھا۔ "مدحتؔ پاشا ۲۶ مارچ کو فوت ہوئے۔ دوسرے پر تھا محمودؔ پاشا ۲ مئی کو فوت ہوئے۔ حالانکہ یہ بالکل جھوٹ تھا۔ کیونکہ دونوں کو ایک ہی دن قتل کیا گیا تھا۔

مدحتؔ پاشا اپنے قتل کے بہت دن سے منتظر تھے۔ واقعہ سے دو تین دن پہلے ایک مرتبہ نماز کے بعد سر جھکائے دیر تک بیٹھے رہے۔ ساتھیوں نے فکر کی وجہ دریافت کی۔ کہنے لگے:

"میں موت کے بارے میں غور کر رہا ہوں۔ جس کی تکلیف ۵ منٹ سے بھی کم میں ختم ہو جاتی ہے۔ سوچتا ہوں۔ کون سی موت سب سے کم تکلیف دہ ہوتی ہے: گلا گھونٹنے کی موت یا گولی کی موت یا بیماری کی موت؟ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں موت کو زندگی پر ترجیح دیتا۔ مگر یہ معاملہ انسان کے اپنے بس میں نہیں ہے۔ دیکھو میں بیمار ہوا۔ موت سے قریب ہو کر پھر دُور ہو گیا۔ ہماری وجہ سے کئی معصوم یہاں قید ہیں۔ شاید ہماری موت اُن کی رہائی کا سبب ہوگی"۔

وفات سے پہلے مدحت پاشا نے خیر اللہ آفندی کو ۴۰ پونڈ دیئے اور کہا: "یہ میرے کفن دفن کے لیے ہیں"۔ مگر خیر اللہ آفندی کو اس خدمت کا موقعہ نہیں ملا۔ اس لیے انھوں نے یہ رقم حکومت کے حوالے کر دی۔

مدحت پاشا اور محمود پاشا، گلا گھونٹ کر قتل کئے گئے۔ مگر حکومت نے یہی مشہور کیا کہ وہ بیمار ہوئے تھے۔ اور اپنی قضا سے مرگئے۔ لیکن دُنیا نے یہ جھوٹ تسلیم نہیں کیا اور بہت جلد حقیقت مشہور ہو گئی۔

سُلطان عبدالحمید اِن دونوں شہیدانِ وطن سے اس قدر خائف تھا کہ بہت دن تک ان کی موت کا اُسے یقین نہیں ہوا۔ چنانچہ دو مرتبہ اُس نے اپنے خاص آدمی حقیقتِ حال معلوم کرنے کے لیے طائف بھیجے اور انھوں نے پُوری تحقیقات کی۔ مگر سلطان کو برابر یہی شک رہا کہ دونوں کہیں بھاگ گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں سلطان نے حکم دیا۔ کہ مدحت کا سر کاٹ کے اُس کے پاس بھیج دیا جائے۔ چنانچہ قبر کھودی گئی۔ سر کاٹا گیا اور ایک صندوق میں بند کر کے روانہ کر دیا گیا۔ مگر چونکہ بیچ

میں نہر سویز پڑتی تھی اور وہاں کا چنگی خانہ بہت سختی سے "تلاشی لیتا ہے۔ اس لیے صندوق پر یہ عبارت لکھ دی گئی:" خاص جلالۃ السلطان کے لیے ہاتھی دانت کی مصنوعات"

مدحت پاشا اور محمود پاشا کی قبریں کچھ عرصہ موجود رہیں۔ مگر احمد راتب پاشا نے اپنی حکومت کے زمانے میں اُن پر سے پتھر اکھڑوا ڈالے اور قبروں زمین سے برابر کر دیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس واقعۂ قتل کے ایک ہفتہ بعد والی حجاز، مرضِ فالج میں مبتلا ہو گیا تھا۔ یہ گویا خدا کا دُنیا ہی میں اُس سے انتقام تھا۔"



مصطفیٰ فاضل پاشا

مصطفےٰ فاضل پاشا

انیسویں صدی کے وسط میں دولت عثمانیہ کی سیاسی و اجتماعی اصلاحات کی جو حرکت شروع ہوئی تھی، عام طور پر اس کی ابتدائی تخم ریزی مرحوم مدحت پاشا کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ مدحت پاشا اس روح تجدید کا داعی اول نہ تھا۔ اسے منظم و وسیع کرنے والا تھا۔ ترکی، صلاح و تجدید کی اصلی تاریخ "مصطفیٰ فاضل پاشا سے شروع ہوتی ہے۔ فی الحقیقت نوجوان ترکوں کی اجتماعی حرکت کا حقیقی موسس وہی تھا۔

اصلاح کی ابتدائی فضا

عثمانی دارالخلافہ میں جس شخص نے یورپ کے تمدنی انقلاب کا پہلے پہل مطالعہ کیا، وہ مصطفیٰ رشید پاشا تھا۔ امراء دولت میں یہی پہلا شخص ہے جس نے یورپ کی زبانوں سے واقفیت حاصل کی۔ اس کی نشو و نما سلطان محمود مصلح کے عہد میں ہوئی تھی۔

۱۸۳۹ء میں جب سلطان موصوف کا انتقال ہوا اور سلطان عبد المجید تخت نشین ہوا، تو یہ لندن میں عثمانی سفیر تھا۔ سلطان عبد المجید نے اس منصب سے ترقی دی اور وزارت خارجیہ پر مامور کر دیا۔ یہ اسی شخص کی سعی کا نتیجہ تھا کہ اسی سال کے ماہ جون میں دولت عثمانیہ کی تنظیم و اصلاح کا وہ تاریخی فرمان صادر ہوا جو "خط گل خانہ" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نام "گل خانہ" اس لیے ہوا کہ سرائے "توپ قپو" کے چمنستان (گل خانہ) میں اس کا اعلان ہوا تھا۔ اس اعلان میں دولت کے قانونی اور منظم ہونے کا یقین دلایا گیا تھا، نیز مسلم اور ذمی کے حقوق کے مساوی ہونے اور ہر طرح کے غیر قانونی امتیازات کے منسوخ کر دینے کا اعلان تھا۔

مصطفیٰ رشید پاشا نے اپنے عہدِ وزارت میں تعلیمی و معاشرتی اصلاحات کی جو روح پیدا کی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ایک قلیل جماعت نئے تعلیم یافتہ افراد کی پیدا ہو گئی۔ ان میں سے سب سے زیادہ نامور شخص دو ہوئے: عالی پاشا اور فواد پاشا دونوں نے صدارت و نظارت کے مناصب تک ترقی کی اور اپنے عہد کے مشاہیر مدبرین میں شمار کیے گئے۔ سلطان عبد المجید کے عہد کے تمام اقدامات اصلاحیہ کی باعث و کار فرما شخصیتیں یہی تھیں۔ معاہدۂ پیرس (۳۰۔ مارچ ۱۸۵۶ء) میں دولت عثمانیہ کو جو کامیابی ہوئی اور انگلستان، فرانس اور اٹلی نے روس کے برخلاف ساتھ دیا، وہ بہت کچھ انہی دونوں کی مساعی کا نتیجہ تھا۔ معاہدۂ پیرس کے بعد ہی تاریخ اصلاح عثمانی کا دوسرا فرمان شائع ہوا تھا جو "خط شریف" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس میں "خط گل خانہ" کی مزید تائید کی گئی تھی اور تمام رعایا کی آزادی حقوق کے احترام کا یقین دلایا گیا تھا۔ یہ بھی تمام تر فواد اور عالی ہی کی مساعی کا نتیجہ تھا۔

مصطفیٰ فاضل

مصطفیٰ رشید، فواد، اور عالی پاشا نے اصلاح و تغیر کے لیے فضا پیدا کر دی، مگر جماعت پیدا کرنے کا کام بعد کو ہونے والا تھا۔ یہ مصطفیٰ فاضل پاشا کی شخصیت تھی، جس نے اس نئی فضا کو نشوونما دی، اور "نوجوان" ترکوں کی جمعیت کا اوّلین سنگ بنیاد رکھ دیا۔ مدحت پاشا بعد کو آیا تاکہ اپنے عظیم اعمال اور عظیم قربانی سے اس سنگ بنیاد پر ایک نئی عمارت چن دے!

مصطفیٰ فاضل پاشا محمد علی بانی خاندان خدیویہ مصر کا پوتا اور ابراہیم پاشا فاتح حجاز و شام کا بیٹا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں پیدا ہوا اور مصر میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ مصر میں محمد علی کے زمانے سے مغربی علوم و السنہ کی اہمیت کا احساس عام ہو چلا تھا، اور خاندان خدیوی کے تمام افراد فرانسیسی زبان کی تعلیم حاصل کرنے لگے تھے۔ مصطفیٰ فاضل کو بھی اس کا موقعہ ملا۔ اس طرح مغربی علوم و تمدن کے فہم و مطالعہ کا دروازہ اس پر کھل گیا۔ ابھی سلطان عبدالمجید ہی کا زمانہ تھا کہ وہ قسطنطنیہ آیا، اور چند سالوں کے بعد سلطان عبدالعزیز تخت نشین ہوا، تو نظارت معارف (تعلیم) کا ناظر مقرر ہو گیا۔ پھر کچھ دنوں کے بعد جب مالیات کی وزارت کی جگہ خالی ہوئی، تو حکومت کی نظر انتخاب اسی پر پڑی۔

لائحہ اصلاحیہ

یہ وہ وقت تھا، جبکہ دولت عثمانیہ کی زوال پذیر ہستی کی حفاظت کے لیے اصلاح و علاج

کی آخری مہلت درپیش تھی اور قریب تھا کہ ہمیشہ کے لیے اس کی شش صد سالہ عظمت و جلال کی دیواریں سرنگوں ہو جاتیں۔ سلطان محمود مصلح نے نئی اصلاحات کی بنیاد رکھی، سلطان عبدالمجید نے اسے بلند کرنا چاہا۔ اگر سلطان عبدالعزیز کا وجود بھی اس سلسلہ اصلاح کی تیسری کڑی ہوتا، تو بہت ممکن تھا، اصلاح و تجدد کی راہیں باز ہو جاتیں۔ لیکن عبدالعزیز کے مجنونانہ استبداد نے جس کے ساتھ شخصی حکمرانی کے تمام عیش پرستانہ عناصر فساد بھی جمع ہو گئے تھے، اصلاح حال کے تمام دروازے مسدود کر دیئے۔ خزانہ بالکل خالی تھا۔ یورپ سے قرضوں پر قرض لیے جا رہے تھے۔ مالیات کے بہترین وسائل مکفول ہو گئے تھے۔ روس نے پیٹرسبرگ سے سرائے دولمہ باغچہ تک اپنی مخفی سازشوں کا جال بچھا دیا تھا۔ روسی سفیر جنرل اگناٹف کا اقتدار روز بروز بڑھ رہا تھا، اور سلطان اپنے تمام معاملات میں اسی کے مشوروں پر کاربند تھا سلطان کا تمام وقت محل کی عیش پرستیوں میں صرف ہوتا۔ بسا اوقات ایک ایک مہینے تک وزراء حکومت کو باریابی کا موقعہ نہیں ملتا۔ شخصی حکومتوں کا قدرتی مزاج ہی شخصی انانیت اور مبتذلانہ قہر و جبر کا ہوتا ہے۔ پھر اگر خصوصیت کے ساتھ اس کا کوئی حکمران "مستبد" ہو جائے تو ظاہر ہے اس کا استبداد کس درجہ لا علاج اور بے پناہ ہو گا؟ تمام ترک اہل قلم متفق ہیں کہ عبدالعزیز اپنے تمام پچھلے مستبد حکمرانوں سے بھی زیادہ مستبد تھا۔ کوئی بات بھی اسے اس درجہ طیش و غضب میں نہیں لاتی تھی جس قدر اس بات کا تصور، کہ دنیا کی کوئی مخلوق اسے "مشورہ" دینا چاہتی ہے، یا نصیحت کرنے کی جرأت رکھتی ہے۔ ابتدا میں جو لوگ بھولے سے کوئی ایسی جرأت کر بیٹھے انہیں فوراً اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ کارخانۂ سلطنت روز بروز درہم برہم ہو رہا تھا اور آنے والے خطرے کے آثار قریب سے قریب تر ہونے لگے تھے۔ یہ حالت

جاری تھی، مگر ہر طرف غفلت و اعراض کا سناٹا چھایا تھا۔ کوئی صدا نہ تھی جو کلمہ حق و اصلاح سے آشنا ہوتی!

لیکن غفلت و افساد کے اس سکون میں بالآخر جنبش ہوئی، اور دولت عثمانیہ کی تاریخ میں پہلی مرتبہ دعوت الی الحق کی بے خوف صدا بلند ہوئی۔ یہ مصطفیٰ فاضل کی صدا تھی۔ وہ صدائے حق جسے نہ تو سلطان عبدالعزیز کی سطوت و جبروت روک سکی، نہ امارت و وزارت کے مطامع مانع آ سکے!

تاریخ میں یہ صدائے اصلاح "لائحہ اصلاحیہ" کے نام سے مشہور ہے یہ دراصل ایک مکتوب ہے جو سلطان عبدالعزیز کے نام لکھا گیا تھا۔ مصطفیٰ فاضل نے یہ مکتوب ۱۸۶۷ء میں لکھا، بذاتِ خاص سلطان کے حوالہ کیا۔ لوگوں کو جب اس جسارت کا حال معلوم ہوا تو شدت تحیّر سے انگشت بدنداں رہ گئے۔ دولت عثمانیہ کی تاریخ میں یہ بالکل ایک نئی قسم کی جسارت تھی۔ ایسی جسارت جس کی مصطفیٰ رشید، فواد پاشا اور عالی پاشا جیسے مصلحین بھی جرات نہیں کر سکتے تھے!

سلطان عبدالعزیز نے یہ لائحہ پڑھا، اور وہی نتیجہ نکلا جو متوقع تھا۔ مصطفیٰ فاضل کو قسطنطنیہ سے ہجرت کرنی پڑی۔ وہ پیرس آیا اور ایک مدّت تک کے لیے یہاں مقیم ہو گیا۔ مصطفیٰ فاضل کے اسی قیام پیرس سے نوجوان ترک جماعت کی سب سے پہلی بنیاد پڑی۔ قسطنطنیہ کے متعدد نوجوان بتدریج پیرس چلے آئے اور مصطفیٰ فاضل کی امداد و سرپرستی میں متحدہ زندگی بسر کرنے لگے۔ اس عہد کے وہ تمام اصلاح پسند افراد جنہوں نے نہ صرف دولت عثمانیہ کے لیے سیاسی انقلاب کی تخم ریزی کی، بلکہ ترکی

علم ادب و کتابت میں بھی دور جدید کی بنیاد ڈالی، اسی عہد کی پیداوار ہیں، نامق کمال بے، ضیا پاشا ادیب، سعد اللہ باشا، ابوالضیا توفیق، وغیرہم کی نشوونما اسی دور میں ہوئی۔

مصطفیٰ فاضل کو اس جسارت کا صلہ صرف مہاجرت ہی کی صورت میں نہیں ملا بلکہ اس کی تمام ترکی جائداد بھی ضبط کر لی گئی۔ اگر فرانسیسی حکومت درمیان نہ پڑتی تو شائد مصری جائداد سے بھی محروم ہو جاتا۔

مصطفیٰ فاضل کا لائحہ تاریخ شرق جدید کا ایک اہم واقعہ ہے جس جرأت و صراحت کے ساتھ وقت کے ایک مستبد سلطان کو مخاطب کیا گیا ہے، اور استبداد و شخصیت کی جگہ آزادی و شوریٰ کی دعوت دی گئی ہے۔ اس کی کوئی دوسری نظیر اس عہد میں نہیں مل سکتی۔ ہم چاہتے ہیں یہ پورا لائحہ اردو میں منتقل ہو جائے، کیونکہ یہ تاریخ شرق جدید کی ایک قیمتی دستاویز ہے۔

مسئلہ اصلاحیہ اور ایک اصل اہم

یہ موقعہ تفصیل کا نہیں لیکن اشارہ ناگریز ہے۔ دولت عثمانیہ میں سلطان مصلح کے عہد سے لے کر سلطان عبدالحمید خاں تک اصلاح و تجدید کی جس قدر حرکتیں ظہور میں آئیں، وہ اگرچہ اس اعتبار سے قابلِ احترام ہیں کہ استبداد و فساد کے مقابلہ میں حریت و اصلاح کی طلبگار تھیں، لیکن ساتھ ہی یہ واقعہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی بنیاد میں یورپ کی عامیانہ تقلید و محاکات کے سوا کوئی مجتہدانہ بصیرت موجود نہ تھی۔

صدیوں سے اسلام کی حقیقی دینی روح مفقود ہو چکی تھی۔ اسلام کے حقیقی سرچشمہ

شرع و تعلیم کی جگہ طرح طرح کے انسانی ساخت کے نئے سرچشمے پھوٹ نکلے تھے، اور اجتہاد و نظر کی جگہ تقلید و جمود کی بنیادیں استوار ہو گئی تھیں۔ ضرورت تھی کہ ایسے اصحاب نظر و بصیرت پیدا ہوتے، جو سب سے پہلے امت کے دینی مزاج کی درستگی کی کوشش کرتے جس کے بغیر حکومتوں کا حاکمانہ مزاج بھی درست نہیں ہو سکتا تھا۔ اس اصلاح کے بعد یورپ کی علمی و صناعی فوائد کے اخذ و اختیار کی راہ خود بخود کھل جاتی۔ البتہ بصیرت و اعتبار کے ساتھ کھلتی۔ تقلید و کورچشمی کے ساتھ نہ کھلتی۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ دولت عثمانیہ میں ایسے علماء ناپید تھے اور ہمیشہ ناپید رہے جو صاحب نظر و بصیرت ہوں۔ امراء و حکام جہل و اوہام کی تاریکی میں گم تھے۔ اتفاقات نے چند شخصیتیں پیدا کر دیں جنہیں یورپ کے علوم و لغات سے آشنا ہونے کا موقع مل گیا۔ یہ اپنی کسی بصیرت و روشنی کی بنا پر نہیں بلکہ محض تقلید کی راہ سے استبداد و جہل کی مضرتوں پر مطلع ہوئے۔ اور اصلاح و انقلاب کی سعی شروع کر دی۔ سعی صحیح تھی، بروقت تھی، لیکن ساعی بصیرت و نظر سے محروم تھے۔ مرض کا احساس غلط نہ تھا، لیکن نہ تو تشخیص کامل تھی، نہ علاج ہی صحیح تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس راہ میں جس قدر قدم بھی اٹھے وہ اگرچہ اکثر حالتوں میں اصلاً غلط نہ تھے، لیکن مجتہدانہ بصیرت و نظر کے فقدان سے کوئی صحیح انقلاب صورت حال میں پیدا نہ کر سکے اور شرح اس اجمال کی بہت طولانی ہے۔

بہر حال بحث و نظر کا یہ مقام دوسرا ہے۔ اس کے فہم و ذوق کے لئے دوسری قسم کی صحبتیں مطلوب ہیں۔ یہاں جو حقیقت قلم بند کرنی ہے یہ ہے کہ گزشتہ صدی کے مشرقی مصلحین کی تاریخ میں مصطفیٰ فاضل پاشا کو اصلاح و انقلاب ترکیہ کے بانی و داعی

ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کا یادگار کارنامہ "لائحہ اصلاحیہ" ہے۔

مصطفیٰ فاضل کا لائحہ

اعلیٰ حضرت!

کلمۂ حق بادشاہوں اور حکمرانوں تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ درباری اس پر پردہ ڈالتے اور چھپاتے ہیں۔ بادشاہ فرمانروائی کے نشہ میں مخمور اور سلطنت کی لذتوں میں غرق، راہِ صواب سے غافل ہو جاتے ہیں۔

وہ خیال کرتے ہیں کہ قومیں اپنے ہی کرتوت سے پریشانی میں پڑتی ہیں۔ اور اپنی ہی غفلت سے پستی میں گرتی ہیں۔ سلطنتیں جب برباد ہوتی ہیں تو قضا و قدر کے بے روک ہاتھوں ہی سے برباد ہوتی ہیں۔

واقعات کو رُو در رُو دیکھنے اور اوہام کو اوہام سمجھنے کے لیے انسان کو بڑے ہی اخلاص اور بڑی ہی جرأت کی ضرورت ہے۔ بادشاہ تک بے کم و کاست حقیقت پہنچانے کے لیے اور بھی زیادہ اخلاص و جرأت کی ضرورت ہے۔

میرے آقا! یہ اخلاص کبھی میرے دل سے جدا نہیں ہوا۔ خود اعلیٰ حضرت سلطان اس کے شاہد ہیں۔ وہ لوگ بھی اس سے ناواقف نہیں جو میری جلاوطنی کا سبب ہوئے ہیں۔ بلاشبہ زمانے نے مجھے موقعہ نہیں دیا کہ روشن کارناموں سے اعلیٰ حضرت کی ذاتِ شاہانہ سے اپنی عقیدت ثابت کرتا اور اپنی قوم کی فلاح و بہبود — اگر یہ نہ کہوں کہ اس کے احیا — کے ارادے پورے کر سکتا۔ لیکن میں پہلا آدمی ہوں جس نے

اعلیٰ حضرت کے سامنے شاہی حکومت کے عیوب بے پردہ کرنے اور وطن عزیز کے مصائب پیش کرنے کی جرأت کی ہے۔ یہ اس لیے کہ میرا دماغ اعلیٰ حضرت اور سلطنت عثمانیہ کی خدمت کے لیے سراسر وقف ہے۔ مجھے اعلیٰ حضرت کے عرش سے جو عقیدت و وابستگی ہے، اور وطن محبوب سے جو محبت و وارفتگی ہے اسی نے مجھ میں یہ قوت پیدا کر دی ہے کہ بے خوف و خطر ان مصائب و آلام پر نظر ڈالوں جو ہمیں رات کی تاریکی اور دن کی روشنی میں پیش آ رہے ہیں۔ حضور کے اخلاق عالیہ پر میرا یقین مجھے ہمت دلاتا ہے کہ ان مصائب کی تشریح کروں۔ کوئی ایک بھی مخفی نہ رکھوں۔ سب کو صاف صاف ظاہر کر دوں۔ پھر وہ علاج عرض کروں جو ہمیں شفا بخش سکتا ہے۔ بشرطیکہ اس کے استعمال سے پہلے وقت نکل نہ جائے۔

میرے آقا! آپ کی مسیحی رعایا کی جانب سے جس سرکشی کا برابر اظہار ہوتا رہتا ہے، وہ یقیناً ہمارے اجنبی دشمنوں کی شرارت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ اس امر کی بھی دلیل ہے کہ اعلیٰ حضرت کی حکومت کا برتاؤ اپنی تمام رعایا کے ساتھ کوئی عمدہ برتاؤ نہیں ہے۔ اس برتاؤ میں اگر حکومت پہلے معذور تھی تو یقیناً اب اُسے برقرار رکھنے میں اس کے لیے کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اس مسلک کا ثمرہ ظلم کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جہل اس سے پھیلتا ہے، فقر و فاقہ اور شر و فساد کی اس سے پیدائش ہوتی ہے

یورپ خیال کرتا ہے کہ سلطنت عثمانیہ میں صرف مسیحی رعایا ہی ظلم و تذلیل کے لیے منتخب کر لی گئی ہے حالانکہ یہ سخت غلطی ہے۔ مسلمان، جن کی حمایت پر کوئی یورپین سلطنت نہیں، مسیحیوں سے زیادہ ظلم اٹھا رہے ہیں۔ ان کے مصائب و آلام کہیں زیادہ

ہیں۔ وہ اب تک محض اس لیے صبر کیے بیٹھے ہیں کہ قضا و قدر پر ان کا پختہ ایمان ہے۔ صبر و سکون کے عادی ہیں۔ نفس بلند رکھتے ہیں۔ ان کی یہ صفات، یورپین تخیل سے بہت بلند ہیں، اس لیے یورپ والے انہیں سمجھ نہیں سکتے۔ پھر یہ مسلمان، ان شریف اور اولوالعزم اسلاف کی نسل ہیں جو فرمانروائی کے تخت پر جلوہ گر ہو چکے ہیں۔ سلطنت سے ان کا اخلاص، قرآن پر ان کے ایمان سے مل کر ایسا راسخ ہو گیا ہے کہ اب تک اس میں تزلزل پیدا نہیں ہوا۔ لیکن اعلیٰ حضرت اپنے مخلص ترین خادم کو یہ عرض کرنے کی اجازت دیں کہ اب مسلمانوں کا بھی پیمانہ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ مصیبت آخری حد تک پہنچ چکی ہے۔ آلام نے ان کا جسم کھا ڈالا ہے۔ اپنا غم و غصہ چھپانے کی اب ان میں قدرت باقی نہیں رہی۔ یقیناً حضور والا کے خاندان اور قوم کے لیے یہ سخت خطرہ ہے کہ رعایا یاس و ناامیدی کا شکار ہو جائے۔

مخلوق پر ظلم بہت سخت ہو گیا ہے۔ آپ یقیناً اُس سے متنفر ہیں، اور میں یقین کرتا ہوں کہ آپ کی اُمت کے عظما و اکابر بھی اس سے بیزار ہیں۔ لیکن وہ مجموعی حکومت کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ حتیٰ کہ خود اعلیٰ حضرت بھی، جن کی قوت معلوم اور سطوت مشہور ہے، شاید اُسے روکنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اس کی خبر سمع مبارک تک پہنچتی ہی نہیں حالانکہ وہ اس امت کی مردانگی تباہ کر رہا ہے۔ اس کی شخصیت گرا رہا ہے، اس کے فضائل برباد کر رہا ہے۔

میرے آقا! آپ کی رعایا میں ایسے مخلص افراد موجود ہیں۔ جن کے دل یہ دیکھ کر حسرت سے پگھلے جاتے ہیں کہ یہ امت — جو ہماری عزت و فخر ہے — کس طرح نسل

کی کمی اور ہجرت کی زیادتی کی وجہ سے کمزور و کم تعداد ہوتی چلی جا رہی ہے لیکن میں اس سے خائف نہیں ہوں۔ ممکن ہے کہ اس میں ہمارے نظام کو بھی کچھ دخل ہو۔ لیکن جس چیز سے میں ڈرتا ہوں اور جسے روز بروز قریب آتے دیکھتا ہوں، وہ یہ ہے کہ ہم مغلوب قوموں کے مشابہ ہوتے جاتے ہیں۔ روز بروز ہماری معنویت کمزور ہو رہی ہے اور یہ مرض قوم کے تمام طبقوں میں عام ہوتا جاتا ہے۔

میرے آقا! ہمارے اسلاف نے چار صدی پہلے مشرق کی رومن شہنشاہیت تہ و بالا کر ڈالی، عروس البلاد اور ملکۂ جہاں 'قسطنطنیہ' میں اپنے قدم گاڑ دیئے اور وہ فتح عظیم حاصل کی جو تاریخ میں ایک عظیم کارنامہ شمار کی جاتی ہے۔ لیکن اس حیرت انگیز کامیابی کا راز کیا تھا؟ صرف دین کا اعتقاد اور جنگ میں شجاعت ہی نہ تھی۔ ان کی وہ اولوالعزمی اور بہادری، درحقیقت، ان کی معنویت ہی کا ایک جلوہ تھا۔ وہ اپنے سرداروں کی اطاعت، خوش دلی سے کرتے تھے، نہ کہ خوف اور مجبوری سے۔ یہی وجہ تھی کہ ذلت ان پر قابو نہ پا سکی۔ عقل پر اندھی تابعداری غالب نہ آ سکی۔ ان کی خودداری برابر باقی رہی۔ استقلال ذاتی نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا۔ اطاعت نظام (ڈسپلن) کی روح، عزت نفس کی روح سے مل گئی تھی۔ دونوں روحیں، مضبوط اخلاق کی بنیادوں پر قائم تھیں۔ فضیلت نے ان میں گھر کر لیا تھا۔ اس لیے انہوں نے وہ عظیم سلطنت الٹ ڈالی جسے استبداد کی رذیلتیں گھن کی طرح لگ گئی تھیں، اور ظلم و جور نے اس کی تمام جڑیں بلا ڈالی تھیں۔

بلاشبہ مضبوط اخلاق ہی اس وجود میں تنہا ایک قوت نہیں ہے کیونکہ یہاں جرائم کی بھی جرار فوجیں کھڑی ہیں، اور گناہوں کے تخت بھی بچھے ہیں۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ

مضبوط اخلاق، ایک مستحکم و راسخ بنیاد ضرور ہے۔ اس کے بغیر کوئی سلطنت قائم نہیں ہو سکتی۔ جب وہ کسی قوم کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو اس قوم کی اجتماعی عمارت بھی گر پڑتی ہے۔ اس کا یہ خاصا عجیب ہے کہ جوں جوں اس کی فتوحات میں وسعت ہوتی ہے اس کا دائرہ بھی وسیع و عظیم ہوتا جاتا ہے۔ برخلاف دوسری قوموں کے جو امتداد زمانہ سے کمزور ہو جاتیں اور کامیابی کے بعد فنا ہونے لگتی ہیں۔

اعلیٰ حضرت کی عظمت اور وطن کی عزت کے تمام خیر خواہ، انتہائی رنج و ملال سے دیکھ رہے ہیں کہ قوم کی شہامت، زائل ہو رہی ہے اور اس کی شرافت و خودداری ختم ہوتی جاتی ہے۔ یہ اعلیٰ صفات قوم میں کیونکر باقی رہ سکتی ہیں، اگرچہ کتنی ہی راسخ ہوں جبکہ مسیحی رعایا کے ساتھ مسلمان بھی گوناگوں ذلتوں کا نشانہ بنے ہوئے ہیں اور ہر قسم کی دنائت کے گھونٹ انہیں زبردستی پلائے جا رہے ہیں؟ مسلمان اور عیسائی، حضور والا کی تمام رعایا، حکام کے ظلم و جور سے چیخ رہی ہے۔ یہ حکام وہ ہیں جو حضور کے برائے نام فرمانبردار ہیں۔ اعلیٰ حضرت کو کیا معلوم کہ وہ شاہی احکام قوم میں جاری کرتے ہیں یا اپنی ہوا و ہوس سے کام لیتے ہیں!

آپ کی سلطنت، عام رائے سے خالی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آپ کے عمال رعایا کے سامنے جواب دہ نہیں ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ خود حضور کے عرش معلیٰ کے روبرو بھی ذمہ دار اور جواب دہ نہیں ہیں، کیونکہ کوئی شخص بھی ان کی شکایت عتبات عالیہ تک پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا، اور چونکہ ان کے جرائم ذات شاہانہ کے علم میں نہیں آسکتے، اس لئے ان سے باز پرس بھی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا وہ بالکل نڈر ہو گئے ہیں۔ رعیت پر

دست درازی میں بے باک ہیں۔ ہر قسم کی برائیاں کھلے بندھوں کر رہے ہیں۔ باشندے دو گروہوں پر منقسم ہو گئے ہیں: ظالم حاکم، کوئی نہیں جو ان کا ہاتھ پکڑے۔ مظلوم رعایا، کوئی نہیں جو اس پر ترس کھائے۔ حاکم، جس کا دعویٰ ہے کہ اس کی قوت، خود سلطان کی قوت ہے، لہٰذا بے روک اور بے قید ہے۔ وہ اس قوت کے گھمنڈ میں جملہ معائب و نقائص سے آلودہ ہوتا ہے۔ محکوم، جس کا کام یہ رہ گیا ہے کہ ذلت کے تاریک غار میں برابر گرتا چلا جائے۔ حکام، جنھوں نے رعایا کے لبوں پر قفل چڑھا دیے ہیں۔ اگر کبھی کسی کے منہ سے فریاد کی چیخ بلند ہو جاتی ہے تو یہ حکام اسے بغاوت قرار دے دیتے ہیں۔ لہٰذا تمام رعایا ناامیدی میں پڑ گئی ہے۔ بے حساب ظلم و جور کے نیچے دبی ہے، مگر خوف سے چپ ہے۔ ظلم کے ہاتھ اُس کا گلا دابے ہوئے ہیں، اور اعلیٰ حضرت سے مخفی نہیں کہ ظلم دلوں میں فساد پیدا کر دیتا اور عقلوں میں فتور ڈال دیتا ہے۔

ترکوں کی رگوں میں پاک اور بے میل خون موج زن ہے۔ یقیناً ہم وطن سے بے حد محبت کرتے ہیں۔ حب الوطنی ہماری ہمتیں بلند کرتی ہے، بڑی سے بڑی قربانیاں بھی ہم پر آسان کر دیتی ہے۔ ہم بہادر سپاہی ہیں، موت سے نہیں ڈرتے۔ ہم میں وقار ہے اور ہمارے اسلاف سے ہمیں میراث میں ملا ہے۔ ہمارا امتیازی وصف صریح اخلاص ہے۔ یہی اخلاص ہمیں آمادہ کرتا ہے کہ مساوات کو جملہ محاسن پر ترجیح دیں۔ لیکن کیا یہ صفات حمیدہ ہم میں زیادہ مدت تک باقی رہیں گی؟ کیا ہم خیر و شر کے اس تصادم کا ہمیشہ یونہی مقابلہ کرتے رہیں گے؟

میرے آقا! جس دن یہ اخلاق ہم سے رخصت ہو جائیں گے، اسی دن ہماری موت

بھی نازل ہو جائے گی۔ ہم کسی کو بھی اپنا حامی و مددگار نہ پائیں گے۔

کاش ہماری مصیبت، صرف ہمارے معنوی انحطاط ہی پر ختم ہو جاتی اور اس جہل عمیم اور فساد عظیم تک نہ پہنچتی جو ہمارے تمام عقلی قویٰ تباہ کر رہا ہے۔

میرے آقا! جب ہمارے اسلاف یورپ میں اُترے تو ان کے پاس علم کی کوئی روشنی بھی نہ تھی۔ لیکن وہ ذوقِ سلیم رکھتے تھے۔ یہ ذوق ان میں قوت و جرأت پیدا کرتا تھا، جیسا کہ تمام پاک اور بلند نفسوں کا خاصہ ہے۔ وہ علم نہیں رکھتے تھے، مگر عقل کے مالک تھے۔ وہ عقل جو حرکت پسند کرتی، جمود سے نفرت کرتی، اور رذالت سے کراہت رکھتی ہے۔ وہ ان لوگوں سے بالکل مختلف تھے جو ہمارے ہراول دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوتے تھے۔ وائے افسوس! عقلیں، اس حکومت کے زیر سایہ مفلوج ہو جاتی ہیں جس میں انفرادی ہمت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی!

میرے آقا! آپ کی رعایا میں ترک سب سے زیادہ استبداد سے متاثر ہوتے ہیں، کیونکہ یہ استبداد ان کی فطری استقامت نفس اور خودداری سے میل نہیں کھاتا۔ ہم ترکوں میں وہ شرمناک قابلیت ذرا بھی موجود نہیں جو بیزنطینی عیاشوں میں تھی۔ ان کی حالت یہ تھی کہ عقل و فطنت رکھتے تھے۔ مگر نہ ذلت سے گریز کرتے تھے نہ مطلق العنان حکومت سے نفرت رکھتے تھے۔ ہم بالکل سادہ دل پیدا ہوئے تھے۔ ہمارے خیالات کی سادگی پر دنیا کو حیرت تھی۔ لیکن جب ہمارے خیالات ہم سے چھین لیے گئے تو ہم مخبوط الحواس ہو گئے۔ عقل کی نعمت سے محروم ہو گئے۔ اگر یہی حالت جاری رہی تو ایک دن آئے گا جب ہم میں حکمرانی کی صلاحیت باقی نہ رہے گی۔ کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہ ملے گا جو انتظام

سنبھال سکے۔

حضور والا! ہم اب ایک ایسے زمانے میں ہیں جس میں عزت اُسی کو مل سکتی ہے، جس کی عقل بڑی اور علم زیادہ ہو۔ یہی باعث ہے کہ تمام یورپ میں علم کا غلغلہ بلند ہے اور تمام قوتیں اس پر صرف ہو رہی ہیں۔ کوئی حکومت بھی اس کے فکر و اہتمام سے خالی نہیں ہے۔ سوٹزرلینڈ میں ایک آدمی بھی اَن پڑھ دکھائی نہیں دیتا۔ انگلستان میں (جس پر مٹھی بھر امرا حکومت کرتے تھے۔ مگر اب اپنے امتیازات سے دست بردار ہوتے جاتے ہیں) ۲۵ برس سے اشاعت تعلیم کی عظیم الشان کوششیں ہو رہی ہیں مجھے یقین ہے کہ پروشیا نے آسٹریا پر صرف اس سبب سے فتح پائی ہے کہ وہ مغلوب سے علم میں زیادہ تھی۔ کیا ہمارے لیے روا ہے کہ اپنے عقلی انحطاط پر قانع رہیں۔ حالانکہ ہمارے گرد یورپ عقلی ارتقاء کے لیے ان تھک کوشش کر رہا ہے ؟

میں اس خیال سے پناہ مانگتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت اشاعت تعلیم کے لیے صرف مدارس کی کثرت کافی تصور فرمائیں۔ وہ محل کس کام کے جنھیں مکین نہ ملیں ؟ مدارس سے کیا فائدہ جن میں ذلت و خواری کی اولاد تربیت پائے ؟

آزادی، قوموں کے لیے اولین مربی ہے۔ آزادی ہی تمام دوسرے مربیوں کو پیدا کرتی ہے۔ کوئی مربی بھی آزادی کا قائم مقام نہیں ہو سکتا۔ کوئی مربی بھی آزادی کا عمل انجام نہیں دے سکتا۔ غلام قومیں علم کی تحقیر کرتی ہیں، کیونکہ علم انہیں کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچاتا۔ قومیں اسی وقت علم کی طرف راغب ہوتی ہیں، جب انہیں اپنے حقوق کی جانب سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ وہ علم اس لئے حاصل کرتی ہیں کہ اپنے حقوق

سے فائدہ اٹھائیں اور بہتر سے بہتر اور زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ہر جاہل اور غلام قوم بزدل ہوتی ہے یا خائن۔

اعلیٰ حضرت! اس وقت ہماری مصیبت صرف یہی نہیں ہے کہ ہم معنوی کمزوری اور عقلی فساد میں مبتلا ہیں۔ ہماری مصیبت اس سے بھی بڑی ہے۔ ہم ہر جگہ ایک جبار و قہار دشمن کو اپنے سامنے پاتے ہیں۔ وہ بے رحم دشمن، ہمارا افلاس ہے۔ حضور نے کتنی مرتبہ اپنے خزانے خالی دیکھے؟ کتنی مرتبہ تنخواہیں تقسیم کرنے کے لیے روپیہ موجود نہ پا کر رنجیدہ ہوئے؟ آپ کا رحیم قلب یہ سوچ کر ہمیشہ کس قدر اداس ہوتا رہتا ہے کہ عمال سلطنت کی تنخواہیں بہت حقیر ہیں؟ یہ اس لیے کہ حضور جانتے ہیں مشرقی عہدہ دار جب تنخواہ کافی نہیں پاتے، تو رشوت خوار ہو جاتے ہیں۔ لیکن سلطنت کے خزانے خالی ہونے پر ہمیں اتنا افسوس نہیں جتنا رعایا کی غربت کا افسوس ہے۔ کیونکہ سرکاری خزانہ محض اس لیے خالی رہتا ہے کہ رعایا غریب ہے۔ رعایا کا افلاس، ایک عظیم ترین خطرہ ہے۔

اعلیٰ حضرت کی سلطنت میں ہر چیز کو زوال آ گیا ہے: زراعت، تجارت، صنعت، کوئی چیز بھی تباہی سے نہ بچی۔ ہم پیدا کرنے کے طریقے بالکل بھول گئے ہیں اور اپنے فقر و فاقہ کے مشاہدہ پر قانع ہیں۔

میرے آقا! اہل یورپ کہتے ہیں کہ ہماری کمزوری اور انحطاط ہماری قومیت اور ہمارے دین کی وجہ سے ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ ہم فوجی زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کسی بات کے لیے موزوں ہی نہیں۔ حالانکہ ان کا یہ خیال حقیقت سے کوئی مناسبت نہیں

رکھتا۔ ہماری امت دنیا کی دوسری امتوں سے کوئی مستثنےٰ صورت حال نہیں رکھتی۔ جس طرح دُنیا کی مختلف قومیں ابتدا میں جنگی قوت سے نمایاں ہوئیں تاکہ اپنی ہستی کے لیے استقلال پیدا کریں، اور پھر علوم و صنائع و تمام اعمال مدینہ کے لیے مستعد ہو گئیں، اسی طرح ہم بھی اپنی جنگی شجاعت سے دُنیا میں نمایاں ہوئے، اور کوئی وجہ نہیں کہ ترقی و سعادت کے تمام اعمال کی طرف قدم نہ بڑھائیں۔ قوم کی ابتدائی حرکت لڑائی میں ظاہر ہوئی یا صنائع میں، مصدر دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے اور وہ حرکت کی استعداد ہے۔ جس میں یہ استعداد ہے اس کی راہ کبھی رُک نہیں سکتی۔ خود یورپ کی مختلف قوموں کا اٹھان ہماری ہی طرح جنگ و عسکریت سے ہوا ہے، اور اب وہ تمدن و صنائع کے میدان میں سب سے پیش پیش ہیں

اسی طرح ہمارے دین پر بھی الزام صحیح نہیں۔ اس دین کی طرح دُنیا کے تمام دینوں کی بھی تعلیم یہی ہے کہ جملہ کائنات مشیئت الٰہی کے ماتحت ہے۔ مسیحیوں کے عقیدے اس بارے میں ہمارے عقیدوں سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ وہ مذہب جبر پر ایمان لائے ہوئے ہیں۔ ان کے پولس رسول کی تعلیم ہے کہ انسان پروردگار کے ہاتھ میں ایسا ہے جیسے گندھی ہوئی مٹی کمہار کے ہاتھ میں ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود بھی اے میرے آقا! انہیں بھلائی اور بہتری حاصل کرنے سے کوئی چیز روک نہ سکی۔

حق کا اظہار ضروری ہے۔ ہمیں جس چیز نے ان کی طرح عملی قوم ہونے سے روک دیا ہے، وہ ہمارا طرز حکومت ہے۔ جس حکومت میں یہ اندھیر ہو کہ ہر ایک انسان دوسرے انسان کی محنت سے بغیر استحقاق کے نفع اٹھائے وہاں نہ عقل ترقی پا سکتی ہے نہ خوشحالی عام ہو سکتی ہے۔ جس ملک میں بھی ظلم پھیل جاتا ہے، مخلوق عمل سے کنارہ کش ہو جاتی ہے، کیونکہ اُسے اپنی

محنت سے متمتع ہونے کا یقین نہیں ہوتا

فرانس کی حالت ہمارے سامنے ہے۔ یہ خوبصورت ملک، جس کے مداح اعلیٰ حضرت بھی ہیں ۱۷۸۹ء سے پہلے سخت غفلت و فلاکت میں پڑا تھا۔ لائق سے لائق وزیر برسرِ حکومت آئے اور بڑی بڑی کوششیں کیں کہ صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت کو رواج دیں، ملک میں حرکت و زندگی پیدا کریں، مگر ناکام رہے۔ ملک نے ایک قدم بھی آگے نہ بڑھایا۔ اس وقت حالت یہ تھی کہ ظلم و استبداد چھایا ہوا تھا۔ رعایا اپنی محنت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ کسان جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے۔ فقر و فاقہ نے انہیں حیوانوں کی سی مخلوق بنا دیا تھا۔ کوئی بھی محنت و مشقت کی طرف رغبت ظاہر نہیں کرتا تھا۔ لیکن صرف تیس برس کی مدت کے بعد اب فرانس، فرانس ہو گیا ہے۔ تمدن و تہذیب کا مرکز ہے علوم و صنائع سے مالامال ہے۔ میرے آقا! یہ حیرت انگیز تبدیلی، صرف نظام حکومت کی تبدیلی کا نتیجہ تھی۔ مستبد حکومت نے ملک کو ویران کر ڈالا تھا۔ آزاد حکومت نے آتے ہی اس میں رُوح پھونک دی۔ ایسی روح جس نے اسے زندہ، جوان، طاقتور، اور خوشحال بنا دیا۔ درحقیقت فرانس پر آزادی کا بہت ہی عظیم احسان ہے۔

میرے آقا! آزادی، قوموں کو زندہ کر دیتی ہے۔ صرف معنوی زندگی ہی نہیں، مادی زندگی بھی بخشتی ہے۔ جب انسان اپنے حقوق سے محروم ہو جاتا ہے تو ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اُس کے تمام جسمانی و معنوی قویٰ معطل ہو جاتے ہیں۔

میرے آقا! جب قوم کی وہ حالت ہو جائے، جو اوپر عرض کر چکا ہوں۔ زمانہ اُس کے اخلاق پر دست درازی کرے، غفلت، آہستہ آہستہ اس کی عقل پر حادی ہو جائے، فقر و

ناقہ اس کا خون چوسنے لگے، اور سلطنت کے خزانے خالی ہو جائیں، تو ایسی حالت میں ہر محب وطن اور مخلص قوم کا فرض ہو جاتا ہے کہ صرف اصلاح کے مطالبہ ہی پر قانع نہ ہو جائے بلکہ عمل کا فوری قدم بھی اُٹھائے۔ اصلاح ایک بے معنی لفظ ہے اگر اُس کے ساتھ عمل نہ ہو۔ کتنے قوانین کا ہم سے وعدہ کیا گیا؟ کتنے نظام شائع کئے گئے؟ مگر کبھی عمل ہمارے سامنے نہیں آیا۔ لہٰذا اب ہم پر فرض ہو گیا ہے کہ ایک قدم آگے بڑھیں اور یہ اہم معروضہ اعلیٰ حضرت معظم کے روبرو انتہائی تعظیم و احترام کے ساتھ پیش کر دیں۔

میرے آقا! آپ اس سلطنت کا ہاتھ پکڑیئے اور اس کا شباب تازہ کر دیجئے۔ دستور (یعنی دستوری نظام حکومت) کا ہاتھ بڑھایئے اور اسے اختلال و بدنظمی سے نکال لیجئے۔ امت کو ایسا دستور بخشئے جس کا جسم تندرست ہو، سینہ کشادہ ہو، نیت نیک ہو۔ پھر اُسے اپنی اماں میں لے لیجئے، ایسا انتظام قائم کیجئے کہ وہ اخلاص سے جاری ہو، امانت سے اس پر عمل کیا جائے، اور ہمیشہ کے لئے دست درازیوں سے محفوظ ہو جائے۔ ایسا دستور جس کے سامنے مسلم اور غیر مسلم، دونوں اپنے حقوق و واجبات میں برابر ہوں تاکہ قومی اتحاد پیدا ہو۔ سب کو سلامتی اپنے سایہ میں لے لے، اور مغربیوں کا یہ کلیہ ٹوٹ جائے کہ "غالب اور مغلوب میں اتحاد، محال ہے"!

آہ میرے آقا! میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے اہل حل و عقد میں منافق اور جاہل، لفظ دستور تک سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اعلیٰ حضرت سے کہتے ہیں کہ دستور بادشاہ کو ایک بے جان کٹھ پتلی بنا دیتا ہے۔ اس کا اختیار چھین لیتا ہے۔ اس کی عظمت سلب کر لیتا ہے دوسری طرف قوم سے کہتے ہیں: دستور تمہیں، تمہاری عزیز ترین خصوصیتوں

دین، لباس، رسم و رواج سب سے محروم کردے گا. لیکن یہ لوگ یا تو دغاباز ہیں یا جہالت نے ان کی عقل پر پردے ڈال دیئے ہیں.

میرے آقا! ان لوگوں کے مشورے پر کان نہ دھریئے. اے میری اُمت! ان کی گمراہی کی پروا نہ کر. دستور صرف خود غرضی کو روکتا ہے. پادشاہ کی صرف اتنی ہی آزادی سلب کرتا ہے کہ وہ رعیت کے معاملہ میں غلطی نہ کرے. اتنا ہی اختیار چھینتا ہے، جتنے غیر معتدل اختیار سے شر پیدا ہوتا ہے. وہ قوم پر کوئی ایسا حکم نہیں لگاتا جو اس کی عزت کے خلاف یا اس کی سعادت کے منافی ہو. وہ دین کی حفاظت کرتا ہے. سلطنت کا نگہبان ہوتا ہے. حقوق کی ضمانت کرتا ہے. دلوں میں اطمینان اُتارتا ہے. ہر انسان کو آزاد اور شریف بنا دیتا ہے!

دستور ہمارے لیے یہ موقعہ بہم پہنچائے گا کہ تمام سلطنتوں سے اپنے تعلقات اور زیادہ بہتر بنا دیں. یہاں اس ملک میں، وہاں یورپ میں کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاملات میں سفراء دول کی مداخلت نے کتنا نقصان پہنچایا ہے؟ یہ لوگ برابر اصلاح اصلاح چلاتے ہیں مگر سب کو معلوم ہے کہ اس مطالبہ سے ان کا مقصود ایک قوم کو دوسری قوم پر ترجیح دینا ہے، یا اس سے ان کی غرض بعض افراد کی خدمت ہے. یہ اور بھی زیادہ برا اور نقصان دہ ہے. لیکن دستور، ہماری حکومت ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم کردے گا کہ کسی اجنبی کو مداخلت کی جرأت باقی نہ رہے گی. تمام رعایا اپنی حکومت کے ظل حمایت میں ہوگی. سب کو عدل و انصاف کے سایہ میں یکساں امن ملے گا. دستور کے سامنے سب آدمی برابر برابر ہو جائیں گے.

میرے آقا! وقت آگیا ہے کہ اسلاف کی سلطنت کو آپ بچالیں۔ اس کی راہ میں ہمارے خون اور ہمارے آنسوؤں کی قربانیاں عظیم تھیں۔ اس کا ماضی، شاندار تھا' اس کا حاضر، حسرت ناک ہے۔ آہ' یہ حاضر خود اعلیٰ حضرت کے رحیم قلب کے لیے کیسا! کس درجہ تکلیف دہ ہے؟ ہمارے گرد ہر چیز ہمیں دھتکار رہی ہے۔ ہمارے ہاتھ کی ہر چیز گرتی اور ٹوٹتی جارہی ہے اعلیٰ حضرت کی دُور بین نظریں یہ سارے خطرے دیکھ رہی ہیں۔ معاملہ سنجیدہ اور واقعی ہے۔ خیال و توہم کی اس میں گنجائش نہیں آپ کے پاس اتنی فوج موجود ہے کہ اجنبی ایندھن سے بھڑکنے والی ہر بغاوت کی آگ بجھا دے سکتی ہے۔ لیکن اس فوج کے پاس نہ تو کھانا ہے کہ مفتوحین کا پیٹ پال سکے، نہ حکمت ہے کہ مغلوبوں کے دِلوں میں اُتار سکے، اور نہ ہی امان ہے کہ خوف زدوں کو اپنے دائرہ حفاظت میں لے لے اور ظالموں کا ظلم روک سکے۔ آپ طماعوں کو اپنے ملک میں نئے نئے امتیازات دے دے کر فیصلہ کا دن دُور کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ کی اس بخشش میں ہمارا حصّہ کیا ہے؟ بہت ممکن ہے فیصلہ کے ہولناک دن میں ہم اسی بخشش کی بدولت اور بھی زیادہ کمزور بے کس' اور فقیر ثابت ہوں۔

میرے آقا! ہر سال جو گزرتا ہے' ہمارے بیرونی مددگاروں کی تعداد کم کرتا اور ہماری داخلی زندگی کا ایک چراغ بجھا دیتا ہے۔ یہ انگلستان ہمارے سامنے موجود ہے۔ اب وہ ہماری امداد کا ویسا خواہش مند نہیں رہا جیسا بارہ[12] برس پہلے تھا۔ یہ آسٹریا جرمنی سے شکست کھانے کے بعد اب مغربی ہونے سے زیادہ مشرقی سلطنت بن گیا ہے۔ اب وہ سلاوی قوموں سے تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے جو ہماری سرزمین میں مقیم ہیں۔

اس سے بھی زیادہ اندیشہ کی بات یہ ہے کہ یورپ کی عام رائے ہمارے برخلاف ہو گئی ہے ۔ ۱۸۵۵ء میں وہ ہماری طرفدار تھی، مگر روز بروز ہم سے منہ پھیرتی جاتی ہے ۔

اگر اعلیٰ حضرت مہربانی فرماکر پیرس، لندن اور روم کے اخبارات پر ایک نظر ڈالیں تو معلوم ہو جائے گا کہ جو قومیں اپنی مصلحت سے ہماری مدد کیا کرتی تھیں، اب وہ ہماری تباہی کا یقین کرنے لگی ہیں ۔ انگلستان فرانس اور اٹلی کے بہت سے مدبر ہمارے حکام کی حرکتیں دیکھ کر اور رعایا پر ظلم و ستم کا مشاہدہ کرکے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اعلان کرنے لگے ہیں " یہ حکومت ہرگز اپنی اصلاح نہیں کر سکتی ۔ اس کا زوال یقینی ہے ہم اسے چھوڑ دیں ۔ اس کی موت جلد واقع ہو جانے دیں !"

میرے آقا! ہمیں ان پیشین گوئیوں کی تکذیب کر دینی چاہئے ۔ لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے کہ اپنی حکومت میں تبدیلی کریں ۔ یہ تبدیلی ضرور بہتر ہو گی، کیونکہ اعلیٰ حضرت کے ارادے اور حکم سے ہو گی ۔ ہم فرانس، انگلستان اور اٹلی پر ثابت کر دیں کہ نہ ہماری قومیت نے ہمیں اس کمزوری اور فساد میں گرا رکھا ہے، نہ یہ ہمارے مقدس دین ہی کا اقتضا رہا ہے ۔

لوگ کہتے ہیں کہ ہم مرچکے ہیں ! ہم زندوں کی طرح عمل کرکے دکھا دیں کہ نہیں، مرے نہیں ہیں، زندہ ہیں !

میرے آقا! ہم پہلی قوم نہیں ہیں جس پر زمانے نے یورش کی ہے ۔ اس کی ہر خوبی بگاڑ ڈالی ہے، اور اس کے تمام قویٰ کمزور کر ڈالے ہیں ۔ ہم آخری قوم بھی نہیں ہوں گے جس کی ایسی زبوں حالت ہوئی ہے ۔ یورپ میں بھی بہت سی ایسی قومیں ہیں جن پر زمانہ

اپنی تمام مصیبتوں کے ساتھ ٹوٹ پڑا ہے، اور ان کا حال بھی بالکل ہمارے جیسا ہو گیا ہے۔ میں اعلیٰ حضرت کے روبرو عرض کر چکا ہوں کہ گزشتہ صدی میں فرانسیسی قوم کس قدر تباہ ہو گئی تھی۔ کس طرح اُس کی صنعت و حرفت برباد ہو گئی تھی۔ کس درجہ اس کی ثروت کمزور ہو گئی تھی کہ ہر دس سال کے بعد دیوالیہ ہو جایا کرتی تھی۔ کس طرح اس کے تمام طبقوں پر ظلم ہو رہا تھا، حتیٰ کہ اُس وقت کے ایک مدبر نے لوئی یا نزدہم سے کہہ دیا تھا "آپ کی سلطنت میں کوئی نہیں جو اپنی عزت پر فخر کرے اور وزیر کے انتقام سے بچ جائے۔ کوئی نہیں جو اپنی بدحالی پر صبر و شکر کرے۔ اور ایک حقیر چپڑاسی کے غصہ سے بھی بچ نکلے!" اُس ملک میں حکومت کا کوئی رعب و دبدبہ باقی نہ رہا تھا۔ اس کے سامنے عمل کی تمام راہیں بند ہو گئی تھیں۔ حواس گم ہو گئے تھے روز ایک نئی روش اختیار کرتی اور بدلتی تھی۔ جنگ ہفت سالہ کے بعد تو فرانس گر کر تیسرے درجے کی دول کے زمرے میں شمار ہونے لگا تھا۔ لیکن اس نے پھر بہت جلد اپنی اصلی جگہ حاصل کر لی۔ چند ہی سال میں اس کی تمام برباد قوتیں واپس آ گئیں۔ حتیٰ کہ اس کی فوجوں نے پورے یورپ کی متحدہ یلغار روک دی۔

یہ حیرت انگیز کامیابی فرانس نے کیونکر حاصل کی؟ صرف اس وجہ سے کہ اس نے حکومت کے بوسیدہ نظام کی جگہ ایک نیا روح پرور نظام قائم کر دیا تھا۔ بلا شبہ یہ شاندار تبدیلی مصائب سے خالی نہ تھی۔ بہت سا خون بہا، بہت سے آنسو گرے مگر یہ مصائب کچھ اس تبدیلی کا لازمی نتیجہ نہ تھیں۔ ان مصائب کی اصلی وجہ یہ تھی کہ تبدیلی اس وقت ہوئی جب اس کے لیے ذرا بھی وقت باقی نہ رہا تھا۔ بالکل آخری لمحہ تھا وہ لمحہ

جس میں اگر قومیں اُٹھ پڑتی ہیں تو اُن کا اُٹھنا بڑا ہی ہولناک ہوتا ہے۔

میرے آقا! ایک فرانسیسی قوم ہی ایسی نہیں ہے جو اپنے مصائب سے صحیح سالم نکل آئی ہو۔ فرانس کے علاوہ اور بھی ایسی قومیں موجود ہیں۔

ریاست پیمیونٹی (اٹلی) کے نواب نے آرزو کی کہ عظیم الشان اٹالین قوم کا بادشاہ ہو جائے۔ وہ بادشاہ ہو گیا! کیونکر؟ اس نے کوئی فوج جمع نہیں کی، کوئی رسالہ تیار نہیں کیا۔ اُس نے صرف یہ کیا کہ قوم کو ایک آزاد دستورِ حکومت بخش دیا اس بخشش کے ساتھ ہی اُس کی فتوحات شروع ہو گئیں۔ زمین کی فتوحات نہیں جن پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا، دلوں کی فتوحات جو دنیا کی حقیقی فتوحات ہیں۔ وہ پورے اٹلی کے دلوں، عقلوں پر قابض ہو گیا۔ مرتے وقت اس نے متبسم لبوں سے پیشین گوئی کی تھی "میرے بیٹے وکٹر عمانوئیل کی سلطنت کا رقبہ میری ریاست کے رقبہ سے تین گنا زیادہ ہوگا" دنیا نے دیکھ لیا کہ بوڑھے نواب کی پیشین گوئی بالکل حق تھی، یہ کیوں ہوا؟ صرف اس وجہ سے کہ دانشمند حکمران نے ٹھیک وقت پر آزادی کا لفظ اپنی زبان سے کہا تھا، وہ لفظ جو اپنے تین حرفوں میں دنیا کی تمام سعادتیں اور کامرانیاں پوشیدہ رکھتا ہے!

میرے پاس اس سے بھی زیادہ روشن اور صاف مثالیں موجود ہیں اور اس کی مستحق ہیں کہ اعلیٰ حضرت ان پر نظرِ غائر ڈالیں۔ لیکن میں اس عریضہ میں اُن سب کا ذکر نہیں کر سکتا۔ میں آسٹریا کا ذکر کروں جو اپنی دستوری آزادی کے سہارے وقت کے عظیم خطروں سے محفوظ گزر رہی ہے؟ پروشیا کا ذکر کروں جو ابھی کل کی بات ہے کہ اپنی تہذیب کی بدولت میدانِ جنگ سے فتح مند نکلی ہے؟ لیکن مجھے زیادہ

بیان کی ضرورت نہیں۔ میں جس قدر عرض کر چکا ہوں، اعلیٰ حضرت کو مطمئن کر دینے کیلیے کافی ہے۔

اعلیٰ حضرت! قوموں کی آزادی اُن کا حق ہے۔ ان کی امانت ہے۔ ان کا ورثہ ہے۔ اور حکومتوں کا فرض ہے کہ اس امانت کے سپرد کر دینے میں تساہل نہ کریں۔ یہ سپردگی ان کی قوت بڑھاتی ہے اور انہیں ہر طرح کے خطروں سے محفوظ کر دیتی ہے۔ آج دنیا کی تمام حکومتیں اس امانت کی سپردگی پر مجبور ہو گئی ہیں۔ کونسی وجہ ہے کہ عثمانی حکومت کو اس عام اجتماعی حالت سے مستثنیٰ تصور کر لیا جائے؟ کیا ترکی قوم زمرۂ اقوام میں شامل نہیں ہے؟

پھر ایسا کیوں ہو؟ کیا اس لیے کہ ہمارا دین ہمیں ترقی وسعادت سے محروم رکھنا اور تمدن و شائستگی سے دُور رکھنا چاہتا ہے؟ میرا جلیل القدر آقا مجھ سے زیادہ واقف ہے کہ ایک لمحہ کے لیے یہ گمان صحیح نہیں ہو سکتا۔

میرے آقا! اس دنیا میں دو سیاستیں نہیں ہیں، اسلامی اور مسیحی۔ عدل ایک ہی ہے، اور سیاست اس عدل کے سوا کچھ نہیں جو حاکم کے ہاتھ سے صادر ہوتا ہے۔

یہ ہمارا دین نہیں ہے بلکہ قدیم نظام ہے جو ہمیں فنا کر رہا ہے۔ اس نے ہمارے مدبروں کی طبیعت بگاڑ دی اور ان کی خودداری زائل کر دی۔ پھر ان مدبروں نے سلطنت کی طبیعت بگاڑ دی اور اس کی عزت تلف ہو گئی۔ پس ہمیں یہ نظام ترک کر دینا چاہیے اور اس کی طرف کبھی لوٹنا نہیں چاہیے۔ اس نظام کے بوجھ کے نیچے امت پڑی سسک رہی ہے۔ یہ نظام حملہ آور دشمن سے ہمیں کبھی پناہ نہیں دے سکتا۔ ہمیں وہ نظام اختیار کرنا چاہیے جو عدل و مساوات اور حریت صادقہ کا نظام ہے، اور جس کا خاصہ یہ ہے کہ

جہاں کہیں قائم ہو جاتا ہے وہاں قوموں کو ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیتا ہے اور عظمت کے محل تیار کر دیتا ہے۔

کیا ہمارے لئے یہ زیبا ہے کہ وہ صوبے جو ابھی حال ہی میں ہم سے جدا ہوئے ہیں اور جنہیں اپنے خون یا دین کے لحاظ سے ہم پر کوئی ترجیح حاصل نہیں، آزاد نظام حکومت کا خیر مقدم کریں، اور ہم پس و پیش میں پڑے رہیں؟ کیا آپ کی سلطنت میں ایسے سچے اور مخلص محب وطن موجود نہیں ہیں۔ جیسے مصر، ٹیونس مولڈاویا، رومانیہ اور سرویہ میں ہیں؟ کیوں نہیں ضرور ہیں۔ انہیں بُلایئے، وہ سر کے بل دوڑ کر آئیں گے۔ ہر شہر میں رعایا کی پسند سے ایک گروہ منتخب کیجئے، وہ آپ کے سامنے رعیت کے معاملات بے نقاب کر دے گا۔ اور پھر وہ راہِ عمل باز ہو جائے گی جس کی جانب حضور کی ابوی شفقت کا رجحان ہے۔ اس کے بعد اپنے شاہانہ ارادے سے رعایا کے نمائندوں کو اپنی سلطنت کے مرکز میں جمع کیجئے۔ وہ عرش اعظم کے رُوبرو رعیت کی ضرورتیں پیش کریں گے اور عتبہ عالیہ تک اس کی آرزوئیں پہنچائیں گے۔

ایک طبیب کہا کرتا تھا "مجھے ایک گز کپڑا دو، میں تمہیں ایک شریف آدمی دے دوں گا۔ اے میرے آقا آپ بھی اپنی سرپرستی میں حقوق عطا کر کے اپنی رعایا کو محنتی، اولوالعزم اور زندہ بنا دے سکتے ہیں۔ وہ آزادی کی بخشش پر حضور کی شکر گزار ہو گی، ظلم اٹھ جانے پر دعائیں دے گی۔ آپ کی خدمت کے لیے اپنی جانیں قربان کرے گی۔ اس کی عقل دُرست ہو جائے گی۔ اُس کا نفس پاک ہو جائے گا، اور اِس طرح وہ اسلاف کی فضیلتیں دوبارہ حاصل کرے گی۔ جب خطرے کا بگل بجے گا تو وہ ہتھیلیوں پر سر لے کر دوڑے گی، عرش

معظم کے گرد جمع ہو جائے گی، اور اعلیٰ حضرت کی نصرت میں خوش و خرم موت کا خیر مقدم بجالائے گی. کیونکہ وہ سمجھے گی، اُس کی تمام سعادتوں کا ضامن و سرچشمہ یہی عرش مبارک ہے۔

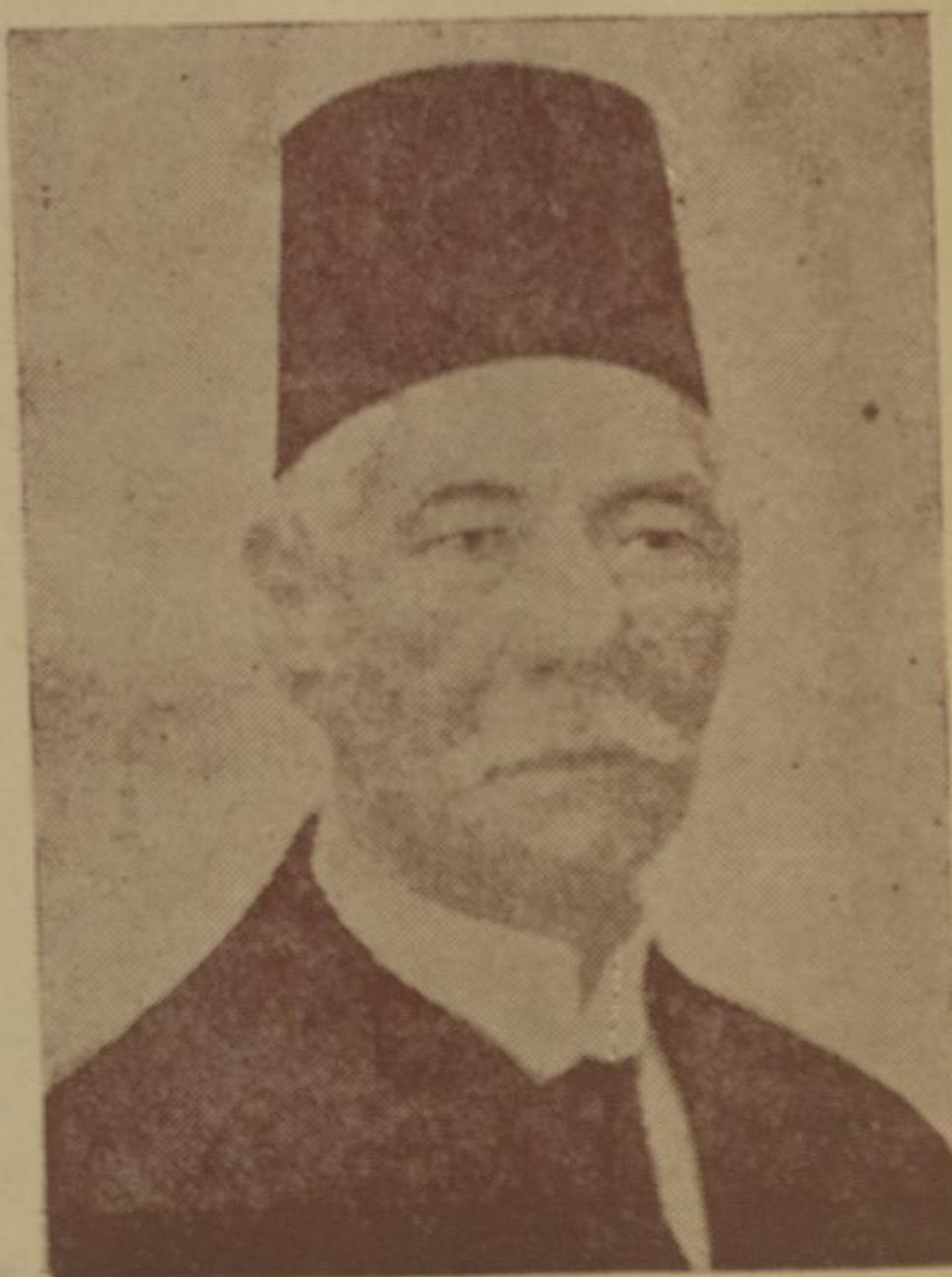
میں یہاں اس دستوری نظام حکومت کی تشریح کرنی نہیں چاہتا جسے میں ملک کی قابلیت، اخلاق اور روایات کے مطابق دیکھنے کا متمنی ہوں۔ میں عنقریب یہ دستور اعلیٰ حضرت کے حضور میں پیش کر دوں گا۔ اسے میں نے اور میرے رفقاء نے ترتیب دیا ہے۔ اعلیٰ حضرت کے علم میں یہ حقیقت پہلے سے موجود ہے کہ میں صاحب غرض نہیں ہوں، مجھے نہ کسی منصب کی طلب ہے نہ کسی عطیئے اور بخشش کی آرزو۔ میری غرض صرف اس قدر ہے، اور میں بلند آہنگی سے اس کا اعلان کرتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت کے رُوبرو سلطنت کی عظیم اکثریت یعنی مسلمانوں اور مسیحیوں کی آرزو رکھ دوں۔ یقیناً جلاوطنی کی تمام تلخیاں مجھ پر آسان ہو جائیں گی، اگر ذات شاہانہ کے سامنے حقیقت عریاں پیش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

اعلیٰ حضرت سلطان معظم! سب سے پہلے خود اپنے ضمیر طاہر کی طرف رجوع کیجئے۔ کہ وہ اس زمانے میں آپ کا کیا فرض بتاتا ہے، جبکہ آپ کی رعیت حیرت میں پڑ گئی ہے۔ اور پورے معنی میں تباہ ہو رہی ہے؟ یہ ایک جلیل القدر عمل ہے۔ اسے وہی انجام دے سکتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نے عزم و شہامت کا وصف عطا فرما دیا ہے۔ جو کوئی بھی یہ عمل عظیم انجام دے گا تاریخ اس کا نام ہمیشہ یاد رکھے گی اور تمام مخلوق اس کا نام عزت و شکر گزاری کے ساتھ لیتی رہے گی!

میرے آقا! اگر زمانے نے حضور والا کو وہ شرف نہیں بخشا جو آپ کی اجداد کے حصے میں آیا تھا، یعنی آپ کے ہاتھوں اس عظیم سلطنت کی بنیاد نہیں پڑی، تو زمانے نے یہ

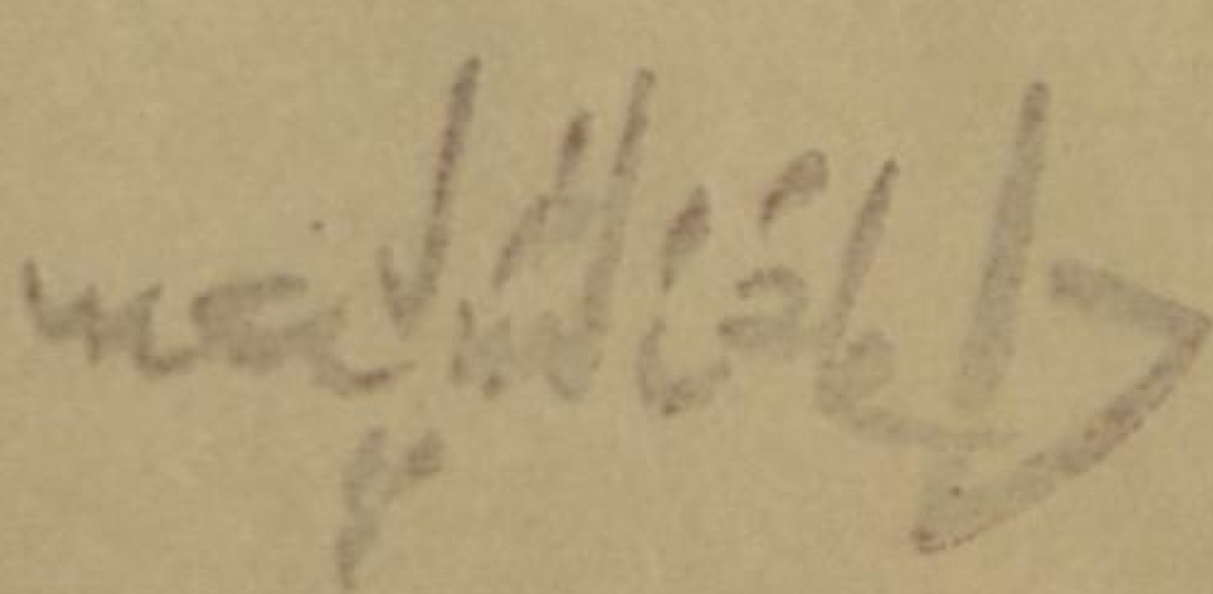
شرف آپ کے لیے محفوظ رکھ چھوڑا تھا کہ اس سلطنت کی عظمتِ رفتہ دوبارہ واپس لانے کا کام آپ ہی کے دست مبارک سے انجام پائے۔ تمام صادق محبان وطن بلکہ آپ کی کروڑوں مسلمان اور مسیحی رعایا کی آوازیں اس دعوت میں میری شریک ہیں۔ کہ حضور اس عمل عظیم و اشرف کی طرف متوجہ ہوں۔ کیونکہ اعلیٰ حضرت ہی اس کے اہل ہیں۔ یہ شرف حضور کے اسم گرامی کو ان عظماء تاریخ کے بلند ناموں کی صف میں لکھ دے گا۔ جن کی تمام مخلوق تعظیم کرتی۔ اور جن کی عظمت کے راگ تمام قومیں گا رہی ہیں۔"

مصطفےٰ فاضل ۱۸۶۶ء



سعد باشا زغلول





سعد پاشا زاغلول

سعد پاشا کا سن ولادت ۱۸۶۰ء ہے ان کی طفولیت کے زمانے میں نئی تعلیم کے مدارس نے اس درجہ فروغ نہیں پایا تھا۔ کہ لوگوں کو ان کی طرف توجہ ہوتی۔ اُن سب کے لیے جو تعلیم کا شوق رکھتے ہوں، صرف ایک ہی جگہ تھی، اور وہ جامع ازہر کی درسگاہ تھی۔ چنانچہ علوم عربیہ واسلامیہ کی متوسط درجہ تک تعلیم انہوں نے اور اُن کے چھوٹے بھائی فتحی بے نے جامع الازہر ہی میں حاصل کی۔

ان کی عمر ابھی بیس برس کی بھی نہیں ہوئی تھی۔ کہ قاہرہ میں سید جمال الدین کی علمی مجالس کی شہرت پھیلی۔ یہ سید موصوف کا مصر میں دوسرا دورہ تھا۔ اور شیخ محمد عبدہ ان کے نہایت سرگرم شاگرد ہو چکے تھے۔ سعد زغلول بھی ان کی مجالس درس میں پہنچنے لگے اور شیخ محمد عبدہ سے اُن کا رشتۂ ارادت و تلمذ

قائم ہو گیا۔ اسی رشتہ نے ان کی اُس تعلیمی ذہنیت میں جو جامع ازہر کے تعلیمی جمود سے پیدا ہوئی تھی۔ ایک انقلابی حالت پیدا کر دی، اور نظر و فکر کی نئی نئی راہیں کھلنے لگیں۔ اُن کی وہ غیر معمولی قوت خطابت و فصاحت جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ اپنے معاصرین میں ممتاز رہے۔ دراصل شیخ محمد عبدہ ہی کی صحبت و تلمذ کا نتیجہ تھی۔

عربی پاشا کی فوجی تحریک جو بہت حد تک سید جمال الدین کی سیاسی تخم ریزیوں کا قبل از وقت نتیجہ تھی۔ جب ۱۸۸۲ء میں نمودار ہوئی۔ تو شیخ محمد عبدہ حکومتِ مصر کے سرکاری گزٹ "الوائع المصریہ" کے محرر اور مطبوعات مصریہ کے مدیر تھے، اور غالباً سعد زغلول بھی ان کے ساتھ اسی دفتر میں کام کرتے تھے، چند ماہ بعد جب خدیو توفیق پاشا کی وطن نردشی اور سلطان عبدالحمید کی مذبذب اور متزلزل حکمتِ عملی کی کمزوری سے "تل الکبیر" کے معرکہ کے بعد انگریزی فوج مصر میں داخل ہو گئی، تو عربی پاشا اور محمود باردوی پر مقدمہ چلایا گیا اور شیخ محمد عبدہ بھی ان کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے۔ ان کا جرم یہ بتلایا گیا تھا کہ انہوں نے وقائع مصریہ میں ایسے مقالات لکھے تھے۔ جن میں تحریک کی حمایت کی گئی تھی۔ غالباً سعد زغلول بھی اُن کے تعلق کی وجہ سے مبتلائے محن ہوئے۔ لیکن بعد کو رہا کر دیے گئے۔ کیونکہ فی الحقیقت شیخ کے تعلق و تلمذ کے سوا اِن کا تحریک میں کوئی حصہ نہ تھا۔

اسی زمانہ میں انہیں نئی تعلیم کا شوق ہوا۔ پہلے فرانسیسی زبان کی تحصیل کی۔ پھر قانون کا مطالعہ کیا۔ اور ۱۸۸۹ء میں وکالت شروع کر دی۔ اُن کی غیر معمولی ذہانت اور طبعی استعداد کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے مصر کی اعلیٰ عدالتوں میں دکالت کرنی چاہی، تو سرکاری محکمہ نے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ نہ تو انہوں نے باقاعدہ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کی تھی، نہ یورپ کے مدارس قانون کی کوئی سند رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے استحقاق واہلیت پر اصرار کیا، اور کہا" اگر اس معاملہ کا دار و مدار استعداد اور اہلیت پر ہے۔ نہ کہ سند کے ایک پرزہ پر، تو قانون کا سخت سے سخت امتحان لے لیا جائے۔ اگر میں یورپ کے سند یافتہ محامیوں سے (مصر میں قانون کے بیرسٹر کو محامی کہتے ہیں) بہتر ثابت ہوں۔ تو میری درخواست منظور کی جائے"۔ یہ واقعہ ہے کہ امتحان لیا گیا۔ اور ان کی قانونی استعداد بہتر سے بہتر معیار پر بھی پوری اُتری۔!

ان کی غیر معمولی استعداد نے بہت جلد ترقی مناصب کی راہ اُن پر کھول دی۔ پہلے بعض قانونی مناصب پر مامور ہوئے۔ پھر ۱۹۰۶ء میں اس درجہ شہرت حاصل کر لی کہ وزیر تعلیم ہو گئے۔

اسی زمانہ میں مصری مجلس تشریع (لیجسلیٹو اسمبلی) کے نظام میں وسعت ہوئی اور نئے نئے طریقے رائج ہوئے۔ یہ ہر موقعہ پر سرکاری مناصب کے لئے ایک اول درجہ کے امیدوار تسلیم کئے جاتے تھے۔ ۱۹۱۱ء میں مجلس تشریع نے

انہیں اپنا رئیس منتخب کیا۔ جس پر وہ (غالباً) ۱۹۱۲ء تک قائم رہے۔

سعد زغلول کا سیاسی مسلک

سعد زغلول کی تعلیمی اور سیاسی، دونوں زندگیوں کی ابتدا شیخ محمد عبدہ کی تعلیم و تاثیر سے ہوئی تھی۔ اس لئے وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں تک (یعنی ۱۹۱۸ء تک جبکہ التوا، جنگ کے بعد انہوں نے مصر کے کامل استقلال کا مطالبہ کیا ہے) اُسی مسلک پر گامزن رہے۔ جو واقعۂ عرابی کے بعد خود شیخ محمد عبدہ نے اختیار کر لیا تھا۔ ہمیشہ اُن کا شمار شیخ کی جماعت کے مخصوص افراد میں رہا۔ وہ اُن تمام لوگوں میں جنہیں شیخ کی فیض صحبت نے پیدا کیا تھا نمایاں اور ممتاز تھے۔

شیخ محمد عبدہ مرحوم کا یہ حال تھا کہ وہ فطرت کی بہترین دماغی بخششیں لے کر پیدا ہوئے، لیکن جامع ازہر کی تعلیمی فضا سے کوئی بلند تر تعلیمی فضا حاصل نہ کر سکے۔ اسی اثنا میں سید جمال الدین مرحوم قاہرہ پہنچے، اور اُن کے فیض صحبت سے شیخ کے تمام فطری جوہر اُبھر آئے۔

سید موصوف کی دعوت اگرچہ تعلیمی اور دینی اصلاح پر مشتمل تھی۔ لیکن اس کا محوری مرکز سیاسی انقلاب تھا۔ کیونکہ وہ یقین کرتے تھے۔ کہ اسلام کی دینی روح سیاسی روح سے الگ نہیں ہے۔ انہوں نے مصر میں بھی انقلابی حکومت کی تخم ریزی کی۔ اُس وقت مصر اسماعیل پاشا کی مسرفانہ عیش پرستانہ زندگی سے تباہ

ہو رہا تھا۔ اغیار و اجانب کی مداخلتوں کے نئے نئے دروازے کھل رہے تھے۔ طالبین اصلاح کی تمام اُمیدیں ولیعہد مصر توفیق پاشا سے وابستہ تھیں۔ سید جمال الدین نے توفیق تک رسائی حاصل کرنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا کہ پہلے خود قاہرہ کے فری میسن لاج میں داخل ہوئے۔ پھر کوشش کرکے توفیق کو بھی اس کا گرینڈ ماسٹر منتخب کرا لیا، اور اس طرح فری میسن کا مخفی اور محفوظ جماعتی دائرہ اپنے اور اس کے گرد کھینچ لیا۔ توفیق پاشا سید موصوف کے اصلاحی خیالات سے پوری طرح متاثر ہوا۔ اور عہد واثق کیا کہ با اقتدار ہوتے ہی اصلاح و انقلاب حال کے لئے پوری طرح کوشش کرے گا۔ لیکن جب کچھ عرصہ کے بعد وہ خدیو مصر ہوا اور سید جمال الدین ان عہود و مواثیق کے ایفا کے طالب ہوئے، تو پہلے تولیت و لعل شروع کیا۔ پھر صاف انکار کر دیا۔ اور کوشش کی کہ سید جمال الدین مصر سے نکل جائیں۔

سید جمال الدین یہ حالت دیکھ کر نہایت متاثر ہوئے۔ اُن کا عقیدہ یہ تھا کہ افراد قوم اور ملک کی نجات کی راہ میں حائل ہوں، اُنہیں راہ سے ہٹا دینا جرم نہیں ہے۔ بلکہ انسانیت کی خدمت ہے۔ چنانچہ انہوں نے توفیق پاشا کے قتل کی کوششیں شروع کر دیں۔ اور اس کام کے لئے قرعۂ فال اُن کے نوجوان تلمیذ محمد عبدہ کے نام نکلا۔ شیخ نے اس واقعہ کے بیس برس بعد ایک خط میں جو مسٹر بلنٹ کے نام لکھا تھا، اقرار کیا ہے کہ توفیق کو قتل کر دینے کے لئے وہ تیار ہو گئے تھے۔ توفیق پاشا قاہرہ سے اسکندریہ جا رہا تھا۔

یہ پستول لے کر سڑک پر کھڑے ہو گئے مگر جب حملہ کا وقت آیا۔ تو انہوں نے محسوس کیا کہ یہ کام اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر انہوں نے ذمہ داری لیتے ہوئے خیال کیا تھا ان کا دل مضطرب ہو کر رہ گیا۔ اور حملہ نہ کر سکے۔

اس کے بعد جمال الدین مصر سے نکل جانے پر مجبور ہوئے۔ اور ہندوستان چلے آئے۔

عربی پاشا کے حادثہ میں شیخ محمد عبدہ کو بھی جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی۔ لیکن چھ سات سال کے بعد جب انہوں نے مصر آنا چاہا۔ تو حکومت نے اجازت دے دی، اور واپسی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد افتاء کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اسی عہد سے مصر میں ان کی دینی و تعلیمی اصلاحات کا اصلی دور شروع ہوتا ہے۔

لیکن ابتدائی سیاسی زندگی کی ناکامیوں کا جو ردِ فعل اُن کے اندر پیدا ہو گیا تھا، ضروری تھا۔ کہ اس کے اثرات ان کے فکری مزاج میں بھی سرایت کر جاتے۔ چنانچہ وہ مدت العمر کے لئے سیاست سے یک قلم علیحدہ ہو گئے اس سے بھی زیادہ یہ کہ مصر میں انگریزی قبضہ کے قواعد کا اعتراف کر لیا۔ اور پوری زندگی نام نہاد اعتدال سے بھی زیادہ محتاط سیاسی عقاید میں بسر کر دی۔ انہوں نے اپنے مشہور مقالہ "الاسلام و النصرانیہ" میں سیاست سے اور ان تمام باتوں سے جو سیاست سے ادنیٰ تعلق بھی رکھتی ہوں، حتیٰ کہ سیاست کے لغوی مادہ سے بھی، جو "تعوذ" کیا ہے وہ ان کی فکری حالت کا مظہر ہے۔

انہوں نے متعدد مرتبہ اپنے اس مسلک کی تشریح بھی کی تھی۔ ان کا خیال یہ تھا۔ کہ انگریزی قبضہ کی وجہ سے اگرچہ مصر کے سیاسی استقلال کو نقصان پہنچا ہے۔ لیکن ساتھ ہی تحریر و تقریر کی آزادی اور تعلیمی و اقتصادی ترقی کے فوائد بھی حاصل ہوتے ہیں۔ ملک کا فرض ہے کہ پہلے اس مہلت سے فائدہ اٹھا کر اپنی تعلیمی اور دینی حالت درست کرکے پھر سیاسی استقلال کے لئے ساعی ہو۔ ان کا جو سیاسی لائحہ مسٹر بلنٹ نے "مصر کی مخفی تاریخ میں شائع کیا ہے وہ تعجب انگیز حد تک ان کی سیاسی قناعت پسندی ظاہر کرتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں ان کا خیال تھا کہ مصر کے لئے بڑی سے بڑی چیز جو ہو سکتی ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ ایک اچھی قسم کی مجلس تشریع (لیجسلیٹو اسمبلی) اسے دے دی جائے۔ جس کی ایک بڑی تعداد کے انتخاب کا حق ملک کو حاصل ہو۔ وہ اس لائحہ میں انگریزی قبضہ کے خلاف ایک لفظ نہیں کہتے۔

بہرحال شیخ محمد عبدہ کا سیاسی مسلک اس نوعیت کا تھا۔ اور چونکہ سعد زغلول بھی انہی کے تلمیذ اور صحبت یافتہ تھے۔ اس لئے سیاسی عقاید میں اس سطح سے بلند نہ ہو سکے۔ سنہ ۱۹۱۸ء تک ان کی تمام زندگی سرکاری مناصب میں گزری۔ اور آزاد قومی تحریکات کے خلاف وہ ویسے ہی ایک سرگرم سرکاری عہدہ دار رہے۔ جیسے مصر کے دفتری اقتدار کے تمام دیگر افراد تھے۔ سنہ ۱۸۹۶ء میں جب مرحوم مصطفیٰ کامل پاشا نے حزب الوطنی کی بنیاد ڈالی۔ تو یہ بھی اس کے ویسے ہی مخالف تھے۔ جیسے مصر کے سرکاری حلقہ کے تمام افراد (بہ استثنا

خدیو عباس، کیونکہ وہ مخفی طور پر مصطفیٰ کامل کا سرپرست تھا) مخالف تھے ۱۹۰۵ء میں جب سید علی یوسف مالک المویہ نے "حزب الامت" قائم کی۔ اس کے اندر بھی سعد زغلول اور ان کے ساتھیوں ہی کا ہاتھ کام کر رہا تھا مقصود یہ تھا کہ حزب الوطنی کو شکست ہو۔ مصطفیٰ کامل پاشا نے جب انتقال کیا اور ان کی جگہ مرحوم فرید بے حزب الوطنی کے رئیس منتخب ہوئے تو جن لوگوں نے ان کی مساعی کی تخریب میں سرکاری وسائل سے کام لیا۔ ان میں ایک سرگرم اور طاقتور شخصیت سعد پاشا کی بھی تھی۔ شیخ عبدالعزیز شاویش نے جب اللوا کی جگہ حزب الوطنی کے لئے "العلم" جاری کیا، تو جس شخص نے سب سے زیادہ اپنے وسائل کار ان کی مخالفت میں خرچ کئے۔ حتیٰ کہ ان کی گرفتاری کے احکام بھی صادر ہو گئے۔ وہ سعد پاشا زغلول ہی تھے!

اس سلسلہ میں ۱۸۹۰ء سے لے کر ۱۹۱۸ء تک جو واقعات پیش آئے وہ بے شمار ہیں، اور ایک مقالہ میں ان کا استقصاء ممکن نہیں۔ مصر کی سیاسی حالت نے ایک ایسی نوعیت پیدا کر لی تھی کہ اس میں دو مذہبوں کے سوا عملاً تیسرے مذہب کی گنجائش ہی نہ تھی۔ یا تو انگریزی قبضۂ مصر سے مصر کو فوراً نجات ملنی چاہیئے۔ یا اسے جاری رکھنا چاہیے۔ یہی دو اصولی اعتقاد "حزب الوطنی" اور "حزب الاحتلال" کی شکل میں ظاہر ہوتے۔ حزب الاحتلال کے داعی یعقوب صروف اور فارس نمر کامل مرحوم کی زبان سے بلند ہوئی تھیں۔ چونکہ قبضۂ مصر کی صریح موافقت مصری طبائع پر بالطبع گراں گزرتی تھی،

اس لیئے ارباب مناصب و موالات اپنے آپ کو حزب الاحتلال میں ظاہر کرنے سے جھجکتے تھے۔ اور اس قسم کی پردہ پوش توجیہیں کرنے لگتے تھے۔ جیسی ہمیشہ ان حالات میں ضعفاء ہمت اور بیچارگان عزم نے کی ہیں۔ مثلاً "تدریجی اصلاحات" کا مغالطہ، "مصالح وقت" کا حیلہ، "تعلیمی استعداد کی تقدیم" کا فریب خیال، اور اسی طرح کے حیل و مغالطات، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ ان تمام لوگوں کی ذہنیت حزب الاحتلال ہی کی ذہنیت تھی، کیونکہ بیرونی قبضہ کی موجودگی میں صرف دو ہی سیاسی عقیدے کسی ملک کے لیئے ہو سکتے ہیں۔ یا تو قبضہ رہنا چاہئیے، یا اُسے فوراً ختم ہو جانا چاہئیے، ان دونوں کے درمیان تیسری راہ ممکن نہیں۔ "ویریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا"۔

۱۹۱۸ء میں انقلاب فکر

بہرحال سعد پاشا کی پوری زندگی جس عالم میں بسر ہوئی تھی۔ اس سے قومی و وطنی جہاد استقلال کا عالم متصل نہ تھا۔ فاصلہ پر تھا۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں جب مصر کو ایک رہنمائے صادق کی ضرورت ہوئی، تو قدرت الٰہی نے اس کا غیر متوقع سامان کر دیا۔ اور اچانک سعد پاشا کی طاقتور شخصیت نمایاں ہو گئی۔ انہوں نے ایک ہی جست میں وہ پورا فاصلہ طے کر لیا۔ جو ان کے پنجاہ سالہ دور حیات اور مصر کی تحریک حریت و استقلال کے درمیان حائل تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر زغلول پاشا جیسا شخص جس کی تمام زندگی حکومت

کے بڑے بڑے ذمہ دارانہ مناصب میں گزر چکی تھی، اور جس کے مداحوں میں لارڈ کرومر تک شریک ہو چکے تھے، اس موقعہ پر مصر کا علم استقلال نہ اٹھاتا، تو یہ تحریک اس قدر طاقت و اہمیت حاصل نہ کر سکتی۔ جو اس نے چند ماہ کے اندر حاصل کر لی تھی!

وفات ——— (مقالہ نگار الہلال)

مصر میں ۲۶ر ستمبر ۱۹۲۷ء، اہم ترین واقعہ، احمد سعد پاشا زغلول کی بالکل غیر متوقع وفات ہے۔ عین اس وقت جبکہ میں ان کی بحالی صحت اور شاہ مصر کی سیاحت انگلستان کے نتائج پر بحث کرنا چاہتا تھا۔ اچانک یہ حادثۂ جانکاہ پیش آگیا۔ حیران ہوں اپنا یہ مکتوب کس طرح شروع کروں؟ مرحوم کی سوانعمری بیان کروں؟ ان نقصانات کا ذکر کروں جو اس واقعہ سے مصر کو پہنچ سکتے ہیں؟ ان کے جنازہ کے شاندار جلوس کا ذکر کروں؟ ان کی جلیل القدر حرم کا ماتم لکھوں؟ وہ نوحہ و بکاہ بیان کروں جو اس وقت تمام ملک میں برپا ہے، جس کا شور میں ان سطور کی تحریر کے وقت بھی سن رہا ہوں، اور جس کا بیان یقیناً میری قدرت سے باہر ہے۔ میں شارع درب الجمامیز میں مقیم ہوں۔ میرے پڑوس میں جتنے مکان ہیں ماتمی آثار و علائم سے غمناک ہیں۔ عورتوں اور بچوں تک کے چہرے ان کے دلی حزن و ملال کی شہادت دے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا قاہرہ کے ہر گھر میں اس کے کسی قریبی عزیز کا ماتم پیش آگیا ہے

آغازِ مرض

۱۵ اگست کو مرحوم کے کان میں خفیف سا التہاب ظاہر ہوا۔ اور بالآخر یہی شکایت مہلک ثابت ہوئی۔ وہ اپنے دیہاتی مقام "مسجد وصیف میں مقیم تھے۔ مرض کی نوعیت دیکھ کر ڈاکٹروں نے رائے دی کہ فوراً قاہرہ واپس آجائیں چنانچہ قاہرہ لائے گئے۔ اور یہاں کے اطباء سے معائنہ کرایا گیا۔

قاہرہ پہنچ کر طبیعت بحال ہوگئی تھی۔ لیکن گزشتہ دوشنبہ کو مرض نے ازسرنو حملہ کیا۔ بارہ بجے رات کو دائیں پہلو میں درد محسوس ہوا۔ منگل کے دن حرارت برابر بڑھتی رہی۔ صبح ۸ بجے مرحوم نے اپنی حرم سے اچانک کہا میں ختم ہوگیا!" یہ کہتے ہی زبان بند ہوگئی، اور اسی دن یعنی ۲۳ اگست کی رات کو ۱۰ بجے طائر روح پرواز کر گیا! انا للہ وانا الیہ راجعون ۰

خبر کیونکر مشہور ہوئی؟

وفات کے دن صبح ہی سے مرحوم کے مکان میں لوگوں کا ہجوم تھا وفات کے وقت ڈاکٹروں کے علاوہ مرحوم کے وفادار مرید اور بھانجے فتح اللہ باشا برکات بھی بستر مرگ کے پاس موجود تھے۔ وفات کے بعد ہی وہ نیچے کی منزل میں اتر کر آئے۔ حاضرین نے دوڑ کر حالت دریافت کی۔ مگر وہ کوئی جواب نہ دے سکے۔ سب حیرت میں تھے۔ اور طرح طرح کے قیاسات لگا

رہے تھے۔ اسی اثنا میں اوپر سے رونے کی صدائیں بلند ہوئیں۔ اس پر حاضرین دوبارہ فتح اللہ پاشا کی طرف دوڑے۔ وہ اب بھی چپ تھے۔ لیکن انہوں نے زور سے اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ مارے۔ یہ اشارہ کافی تھا۔ ایک لمحہ کے لئے سب پر سناٹا چھا گیا۔ پھر بیک وقت سب کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ یہ حادثہ ایسا دل ہلا ڈالنے والا تھا کہ رونے پر کسی کو ملامت نہیں کی جا سکتی تھی۔ کہرام مچ گیا تھا۔ عین اس وقت ڈاکٹر شفیق اوپر سے اتر کر آئے اور مضبوط آواز میں چلائے "سوگوار بیوہ پر رحم کرو! تمہارا رونا اسے ہلاک کر ڈالے گا۔ سعد مر گئے، لیکن اگر تم چاہو تو انہیں اپنے دلوں میں ہمیشہ زندہ رکھ سکتے ہو؟"

مگر یہ وقت نصیحت سننے کا نہ تھا۔ نالہ و بکا برابر بلند رہا۔ قرب و جوار کے لوگوں نے سنا۔ تو ان پر بھی یہی حالت طاری ہو گئی۔ چشم زدن میں یہ منحوس خبر تمام شہر میں پھیل گئی۔ اب کوئی نہ تھا۔ جو اس حادثہ قوم و ملت پر حاوی نہ ہو!

اسی وقت تار کے ذریعہ تمام دنیا میں خبر پھیل گئی۔

سعد پاشا کی بیوہ

سعد پاشا کی وفات پر ان کی بیوی کا جو حال ہوگا، ظاہر ہے مصر میں ان دونوں کی محبت ضرب المثل اور تمام مردوں اور عورتوں کے لئے نمونہ تھی۔

سعد پاشا کو اُن سے اس درجہ محبت تھی۔ کہ اگرچہ ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر انہوں نے کبھی دوسری شادی کا خیال نہیں کیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ مرحوم نے اپنی تمام دولت اور جائداد بھی اپنی بیوی کو باضابطہ ہبہ کر دی تھی۔ ظاہر ہے ایسے وفادار شوہر کی موت اور پھر اس شوہر کی موت جس کی عظمت ساری دنیا تسلیم کرتی تھی، اس کی بیوہ کے لئے کیسی عظیم مصیبت ہوگی؟ ادھر کئی سال سے یہ معزز خاتون بیمار ہے۔ ڈاکٹروں نے سختی سے ممانعت کر دی تھی کہ مریض کی خدمت میں حصہ نہ لے۔ مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ اس قدر ناتواں تھی کہ بہ مشکل چل سکتی تھی۔ اس پر بھی تیمارداری میں ہمہ تن مشغول رہتی تھی!

اخبارات نے وہ مؤثر مناجات شائع کر دی ہے جو بیوہ نے اپنے متوفی شوہر کی نعش کو مخاطب کر کے کی تھی۔

مجلس وزراء

اطلاع پاتے ہی مجلس وزراء کا ایک فوری جلسہ منعقد ہوا۔ اور اس نے قوم کے نام حسب ذیل اعلان شائع کیا۔

"وزراء، انتہائی رنج والم کے ساتھ مصری قوم کو اس کے عظیم رہنما سعد پاشا زغلول کی وفات کی جانکاہ خبر پہنچاتی ہے۔ مختصر بیماری کے بعد موت کے بے پناہ ہاتھ نے قوم کے رہنما، اس کی امیدوں کے مرکز، اُس

کی بیداری کے قائد، اس کی حمایت کے علم بردار کو ذرا بھی مہلت دئے بغیر چھین لیا۔ خدا مرحوم پر اپنی رحمت نازل کرے۔ اور قوم کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جنازہ

رات بھر مرحوم کے مکان میں زائرین کا ہجوم رہا۔ دوسرے دن صبح ۹ بجے تمام وزراء اور سفراء دول بھی پہنچ گئے۔ بارہ بجے دن کو نعش بالائی منزل سے نیچے لائی گئی۔ اس پر صرف کفنی تھی۔ کوئی قیمتی چادر نہ تھی۔ نیچے آتے ہی پھولوں کی بارش شروع ہو گئی۔ بے شمار ٹوکرے پھولوں سے بھرے ہوئے لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ نعش کو دیکھ کر ایک مرتبہ پھر گریہ و بکا برپا ہو گیا!

اب مصری فوج بھی پہنچ چکی تھی۔ جنازہ سرکاری طور پر اٹھانا طے پایا تھا۔ تمام سرکاری عہدے دار، امراء، وزراء، سفراء، پارلیمنٹ کے ممبر، مسلمان قطبی، رومی، ارمن، یہودی فرقوں کے علماء کاہن، ربّی اور احبار، اپنے اپنے خاص لباس میں موجود تھے۔

جب تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ تو سعد پاشا کی بیگم سیاہ نقاب منہ پر ڈالے برآمد ہوئیں۔ وہ ضعف سے چل نہیں سکتی تھیں۔ کئی عورتوں کے سہارے وہ اپنی موٹر تک پہنچیں، مگر بیٹھنے سے پہلے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ فوراً منعش دوائیں دے کر انہیں ہوش میں لایا گیا۔ اب وزراء اور فوجی افسروں نے نعش اپنے

کاندھوں پر اٹھائی۔ اور توپ کی گاڑی پر رکھی۔ اس وقت کا منظر ناقابل بیان ہے۔ معلوم ہوتا تھا۔ مصر کا آسمان و زمین ماتم کر رہا ہے۔ رونے والی عورتوں اور مردوں کی چینیں باہم مل گئی تھیں۔ کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ نہیں معلوم رونے والوں میں کتنی قوت پیدا ہو گئی تھی۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسوؤں کے کتنے دریا سما گئے تھے۔ کہ نوحہ و بکا کا سلسلہ کسی طرح بھی رکنے پر نہیں آتا تھا"!

مصری عالم

اس وقت محبت و عقیدت کا ایک جھگڑا پیش آگیا۔ فوج کے افسروں نے نعش اٹھانے سے پہلے کہا "جنگی روایات کی رو سے ضروری ہے کہ مرحوم کی نعش پر مصر کا فوجی پرچم ڈالا جائے۔" ساتھ ہی انہوں نے اپنا پرچم پیش بھی کر دیا۔ مگر مرحوم کی بیوہ نے اس سے انکار کیا۔ انہوں نے ایک ریشمی علم پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ انہوں نے اصرار کیا کہ نعش اسی میں لپیٹی جائے۔ مجبوراً افسروں کو اپنی ضد سے باز رہنا پڑا۔

اس کے بعد ملکی افسروں نے کہا "مرحوم کے تمام تمغے ان کی نعش پر رکھے جائیں۔ کیونکہ وہ ہماری جماعت کے آدمی تھے" مگر بیگم زغلول نے اس سے بھی انکار کیا۔ انہوں نے کہا سب سے بڑا تمغہ مصری علم ہے۔ اس تمغہ پر کوئی دوسرا تمغہ نہیں رکھا جا سکتا"

جوں ہی نعش توپ پر رکھی گئی۔ منادی نہایت ہی بلند آواز سے چلایا ۔ لا الہ الا اللہ۔ البقاء اللہ" ہر طرف سے نعرے بلند ہوئے "رحماک یا سعد!" عورتیں چلائیں "فلتحی ذکری سعد!" ایک عجیب قیامت برپا ہو گئی۔ اگر فوج اور پولیس کا انتظام غیر معمولی نہ ہوتا، تو یقیناً بے شمار جانیں ضائع جاتیں کیونکہ نعش کے بلند ہوتے ہی ہزاروں آدمیوں نے بیک وقت آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ ہر شخص کی یہی خواہش تھی کہ سعد کی نعش کا بوسہ لے لے۔ یا کم سے کم اسے چھو ہی لے۔ مگر فوج اور پولیس نے پرجوش مجمع کو روک لیا۔ اور ٹھیک ۸ بجے جنازہ روانہ ہو گیا۔

جلوس میں سب سے آگے فوج کا ایک بڑا دستہ اپنا جنگی باجا بجا رہا تھا اس کے بعد مزدوری پیشہ طبقہ کی مختلف جماعتیں تھیں۔ ریلوے کے مزدور، کارخانوں کے مزدور، گاڑیبان، لوہار، حجام، غرض کہ مختلف پیشہ وروں کی علیحدہ علیحدہ صفیں تھیں۔ ان کے پیچھے پھر فوج اپنے باجے کے ساتھ تھی۔ اس کے پیچھے مختلف تجارتی کمپنیوں کے مزدور اور کارکن تھے۔ چھاپے خانوں کے مزدوروں کی صفیں، ان کے بعد تھیں، پھر۔ ۔ ۔"

مگر میرے لئے یہ تمام تفصیل بیان کرنا ناممکن ہے۔ صرف اس قدر کہہ دینا کافی ہے۔ کہ قاہرہ میں جتنی جماعتیں اور فرقے موجود ہیں، جتنے مدارس قائم ہیں، جتنی انجمنیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ جتنی بھی مخلوق موجود ہے اس کا بڑا حصہ جنازے کے ساتھ ماتم کناں موجود تھا

اس جلوس میں ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس میں ہر طرف ہلال اور صلیب دونوں کے علم بلند تھے۔ دونوں ہوا میں ہلتے تھے۔ اور ہم آغوش ہوجاتے تھے۔ یہ نظارہ نہایت ہی پُراثر تھا۔ یہ اس حقیقت کا ثبوت پیش کر رہا تھا کہ مصر میں اب ایک ہی عنصر باقی ہے، اور وہ آزادی خواہ مصری قوم ہے اور یہ کہ سعد زغلول کسی ایک فرقہ کا رہنما نہ تھا۔ بلکہ مصر کے تمام فرقوں کا یکساں طور پر رہنما تھا۔ وہ جس طرح مسلمان مصریوں کا محبوب تھا۔ اسی طرح مسیحی مصریوں کا بھی محبوب تھا؟

نمازِ جنازہ

ٹھیک ۲ بجے جنازہ، مسجد قیسون میں پہنچا۔ یہاں لاکھوں مخلوق نے نماز جنازہ ادا کی۔ صفوں میں سینکڑوں قبطی عیسائی اور مصری یہودی بھی مسلمان نمازیوں کے دوش بدوش کھڑے تھے، اور اپنے سردار کی مغفرت کے لئے رب العالمین سے الحاح وزاری کر رہے تھے!

قبر پر!

نماز کے بعد جنازہ پھر آگے بڑھا۔ اور حضرت امام شافعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبرستان کی طرف روانہ ہوا۔ قبر کے قریب پہنچکر جلوس رُکا۔ ۷ آدمیوں نے گاڑی پر سے نعش اتاری۔ ان میں دو قبطی عیسائی بھی شامل تھے۔ قبر میں

نعش اتارنے والے بھی یہی لوگ تھے۔ اس وقت کا ماتم ناقابل بیان ہے۔ دنیا کا کوئی قلم بھی اسے نہیں لکھ سکتا۔ ایسا ماتم تھا کہ دل ہلے جاتے تھے۔ ہمعزز آدمی بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

اس تمام دوران میں قلعہ سے توپیں دغتی رہی تھیں۔ میسی گرجوں کے گھنٹے بج رہے تھے۔ تکبیروں کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ قاہرہ پورے معنی میں نشانِ غم بن گیا تھا۔

مٹی دینے سے پہلے فتح اللہ باشا برکات قبر میں اترے۔ اور مرحوم کو آخری سلام کر کے نکل آئے۔

وزیر داخلہ کی تقریر

اس مؤثر موقعہ پر جعفر والی باشا وزیر داخلہ کھڑے ہوئے اور کہا:۔

"سعد، مر گیا۔ اُف، کیسی سخت مصیبت درپیش ہے! یہ ایسی مصیبت ہے جس کا غم کبھی دور نہیں ہوگا۔ سعد پاشا نے جن اعلیٰ اصول پر اپنی زندگی قربان کی، الحمد للہ، اب وہ اصول تمام مصری قوم کے دلوں میں راسخ ہو چکے ہیں۔ اگر یہ جلیل القدر وجود اپنے جسم سے دور ہو گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس کی روح ہمارے اندر برابر زندہ رہے گی۔ ہم سب ایک ایک کر کے اسی طرح مر جائیں گے، مگر قوم اس شخص کی پیدا کی ہوئی روح

سے ہمیشہ زندہ رہے گی؟

پارلیمنٹ کی تعزیت

وفات کے دوسرے دن پارلیمنٹ کے تمام ممبر "بیت الامہ" (یعنی قوم کا گھر۔ یہ اس مکان کا نام ہو گیا ہے۔ جس میں سعد پاشا رہتے تھے) میں جمع ہوئے، اور بیگم زغلول کے سامنے حسب ذیل تقریر کی:-

"مرحوم و مغفور رہنما کی حرم محترم!"

"یہ موقعہ ہمارے لئے نہایت ہی دردناک ہے کہ بیت الامہ میں جبکہ وہ سعد سے خالی ہو چکا ہے۔ اس کی رفیق حیات کی تعزیت کو حاضر ہوں"

"معزز خاتون! مصری قومیت کی تعمیر میں سعد نے پہلی اینٹ رکھی اس نے پوری سرزمین مصر کو ایک قوم بنا دیا۔ اور اس کا ایک ہی نعرہ قرار دے دیا۔ وہ نعرہ، کامل آزادی کا نعرہ ہے۔ اس نے پوری قوم کی ایک صف بنا دی۔ خود آگے کھڑا ہوا، اور منزل مقصود کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے آزادی کی صفیں آگے بڑھائیں۔ عزت و عظمت کی راہوں میں داخل ہوا۔ تمام مشکلیں حل کر ڈالیں۔ رکاوٹیں دور کر دیں۔ اپنی بے نظیر قربانیوں سے منزل مقصود قریب کر دی۔ اپنی بے مثل شجاعت سے ناممکن کو ممکن بنا دیا"!

"سعد، دستوری حکومت کا باپ تھا، محافظ تھا، سپہ سالار تھا، سپاہی تھا۔ پارلیمنٹ کا سب سے پہلے کھولنے والا تھا۔ منبرِ خطابت کو سب سے پہلے ہلا ڈالنے والا تھا۔ حکومت کے ایوان میں سب سے پہلے اسی کی حق گو آواز گونجی تھی!"

"سعد ہی نے پارلیمنٹ کے اصول مقرر کئے، ضوابط بنائے دستورالعمل مرتب کیا۔ اس کی عزت بڑھائی۔ اس میں عظمت پیدا کی۔ اسے قوت بخشی اپنے جاہ و جلال کا ایک عظیم پرتو اس پر ڈالا۔ اور وہ پُرجاہ اور پرجلال بن گئی"

"سعد اپنی صدارت کی کرسی پر حق و باطل کی سچی میزان تھا۔ دور اور نزدیک کے لئے روشنی کا ستون تھا۔ فصاحت میں صادق البیان تھا۔ پیری میں شباب عزم تھا۔ فیصلہ کی عظمت تھا۔ لفظ میں بلاغت تھا۔ حجت بالغہ تھا۔ آیۃ الہدیٰ تھا۔ ہدایت کا نور تھا۔ عقل کا ستون تھا۔ خطابت کا امام تھا۔

"محترم خاتون! اس وقت جبکہ حزن و ملال نے آپ کو اپنی موجوں میں لے لیا ہے اور جبکہ سعد پر رب کریم کی نظرِ عنایت پڑ رہی ہے، ہم اپنے زخمی دلوں کے ساتھ تعزیت پیش کرتے اور قسم کھاتے ہیں کہ جب تک زندگی باقی ہے کامل آزادی کے حصول کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ دستور حکومت کی حفاظت کریں گے۔

"محترم خاتون! سعد نہ آپ کا تھا نہ ہمارا تھا۔ وہ خدا کا تھا اور وطن

کا تھا۔ اس نے اپنی تمام جرأت و ہمت، عظیم قربانیاں، عزمِ راسخ، غرض کہ جتنی بھی مافوق العادت قوتیں اسے ملی تھیں، سب کی سب اپنے وطن کی خدمت پر وقف کر دی تھیں، یہاں تک کہ موت آگئی اور اسے شہادت نصیب ہوئی سعد شہید وطن ہے!"

"سعد اپنی قبر میں آرام سے سوئیے، کیونکہ وہ اپنے پیچھے ایک ایسی قوم چھوڑ گیا ہے جو اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی۔ پس سعد پر اس کی زندگی میں سلام ہو۔ اور موت کے بعد قبر میں بھی "

تقریر یہاں تک پہنچی تھی کہ فتح اللہ باشا نے بالائی کمرے سے چلا کر کہا۔ حضرات! سعد باشا کی حرم محترم آپ سے درخواست کرتی ہیں کہ خاموش ہوجایئے وہ کہتی ہیں "آپ کی تقریر سے میرا دل پھٹا جاتا ہے۔ آپ کی ہمدردی کی از حد شکر گزار ہوں۔ میری زبان اس کے اظہار سے قطعاً عاجز ہے۔ خدا سے میری دعا ہے کہ آپ کو سلامت رکھے۔ زندہ باد مصر"!

سعد پاشا کی حرم کا بیان

" صفیہ خانم زوجۂ محترمہ سعد پاشا مرحوم نے قوم کے نام حسب ذیل بیان شائع کیا ہے:۔

میرے فرزندو!

" اگر سعد، جوابِ جوارِ خداوندی میں پہنچ چکا ہے، محض اکیلی کا سعد ہوتا

تو اس کی موت پر تمہاری تعزیتوں کا شکریہ ادا کرتی. لیکن وہ پورے مصر کا سعد تھا، وہ مصر کا سپہ سالار تھا. امین تھا. اس کی موت کی مصیبت، خود تمہاری مصیبت ہے. اس کا ماتم خود تمہارا ماتم ہے. اگر مجھے شکریہ ادا کرنے کا کوئی حق پہنچ سکتا ہے. تو وہ صرف اسی لحاظ سے کہ اس کی محبت مجھے حاصل تھی اس کی نیکی مجھ پر دائمی تھی. اس کے نام کی عزت مجھے نصیب ہوئی تھی اس کی وجہ سے تمہاری محبت اور قومی حکومت کی شفقت مجھے میسر آئی. اگر اتنا حق میرے لئے منظور کرو. تو میرا شکریہ قبول کر لو. ایسا شکریہ، جس کے اخفا کی قدرت میرے دل میں نہیں ہے. اور جس کے اظہار سے میری زبان قاصر ہے!"

"میرے بچو! سعد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک اعلیٰ مطمح نظر تھا. سعد مر گیا مگر الحمد للہ یہ مطمح نظر ہنوز باقی ہے. اس کی محبوب شکل ہم سے اوجھل ہو گئی مگر اس کی قیمتی یاد ہمارے دلوں میں زندہ رہے گی. والذکرا تنفع المومنین!"

"اگرچہ اس کی جدائی کے غم نے ہمارے دل توڑ ڈالے ہیں. لیکن آؤ، اس غم کو مزید حمیت و شجاعت کا ذریعہ بنائیں. یہ غم ہماری ہمتیں بلند کرنے والا اور ہم میں ایک بالکل نیا جوش پیدا کرنے والا ہو. کیونکہ شریف غم ایک ایسی قوت پیدا کر دیتا ہے. جو بے روک ہوتی ہے. ایسی ہمت لاتا ہے جو لامتناہی ہوتی ہے. اگر سعد کا ہم پر کوئی حق ہے. تو وہ حق یہی ہے کہ ہم امید کو نہ چھوڑیں کیونکہ یہ پودا اسی کا لگایا ہوا ہے. ہم اس کے حسن ظن کے مطابق ثابت ہوں.

اس کا کام پورا کریں۔ اس کی رکھی ہوئی بنیاد پر اپنی عمارت کھڑی کر دیں۔ مصر کو یاد رکھیں۔ مصر کے سوا سب کچھ بھول جائیں۔ مصر ہی ہمارا ابتداء و منتہا ہے اسی سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اسی کی خاک میں مل جانے والے ہیں۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یقین کرو، سعد کو اپنی صفوں میں پائیں گے۔ بلکہ ہر خادم وطن، ہر مجاہد وطن سعد کو اپنے دل کے اندر دیکھے گا۔ یہ اس لئے کہ سعد، جس سے ہم محبت کرتے، اور جسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہتے ہیں، دراصل ہمارا وہ مطالبۂ حق ہے جس کے لئے ہم کوشاں ہیں۔ یعنی آزادی، خود مختاری اسی پر ہم چلیں گے اور اسی پر ہم مریں گے۔"

"میرے عزیزو! آج مصر تمہاری طرف دیکھ رہا ہے، تم بھی اسے دیکھو۔ وہ تمہیں پکار رہا ہے۔ تم بھی اس کی آواز سنو۔ تم نے کبھی اس کی پکار سے کان بند نہیں کئے۔ آج پھر اس کی طرف دوڑو۔ بے شک سعد مر گیا، مگر مصر زندہ ہے۔ بے شک قوم کا رہنما مر گیا، مگر قوم زندہ ہے! قومی آرزوؤں کا نشان مٹ گیا۔ مگر قومی آرزوئیں زندہ ہیں۔ آؤ ہم بڑھ کر سعد کا جھنڈا اپنے کاندھوں پر اٹھا لیں۔ وہی اللہ جس نے مصر کے لئے ظلمت غفلت کے بعد نور بیداری کی راہ باز کر دی تھی، ہمیں آئندہ بھی راہ راست دکھائے گا اور قوم کے لئے سعد کا نعم البدل پیدا کر دے گا"

سعد پاشا کی یادگار

مجلس وزارت نے سعد پاشا کی یادگار قائم کرنے کے لئے حسب ذیل تجویزیں

منظور کی ہیں :-

(۱) مرحوم کا ایک بلند مجسمہ قاہرہ میں اور ایک اسکندریہ میں قائم کیا جائے یہ دونوں مجسمے مرحوم کو حالت خطابت میں ظاہر کریں گے۔

(۲) "بیت الامہ" (سعد پاشا کا مکان)، خرید کر قومی عمارت بنا دی جائے۔ اس کا نام بدستور یہی رہے گا۔ مرحوم کی بیوہ کو زندگی بھر اس میں رہنے کا حق ہوگا۔

یہ مکان مرحوم نے ۱۹۰۱ء میں تعمیر کیا۔ اور اپنی حرم محترم پر وقف کر دیا تھا۔ وزارت نے طے کیا ہے کہ مکان کا وہ تمام سامان اسی ترتیب سے باقی رکھا جائے گا۔ جس طرح مرحوم کی وفات کے بعد تھا۔ حتیٰ کہ مرحوم کے کپڑے بھی محفوظ رکھے جائیں گے۔ ان کپڑوں میں ایک سرخ جبہ بھی ہے جو وہ اپنے وطنی لباس کے اوپر پہنا کرتے تھے۔ لکھنے پڑھنے کا بھی سامان علی حالہ رکھا رہے گا۔ گھر کی ہر چیز پر لکھا جائے گا کہ کب خریدی گئی؟ کیوں خریدی گئی؟ اور مرحوم اس سے کیا کام لیتے تھے!

(۳) بیت الامہ ہی میں مرحوم کی نعش دفن کی جائے گی۔ ان کی موجودہ قبر عارضی ہے۔ اس نئے انتظام کی تکمیل اور جدید شاندار مقبرے کی تعمیر کے بعد نعش یہاں منتقل کر دی جائے گی۔

(۴) سعد پاشا "ابیانہ" گاؤں کے جس مکان میں پیدا ہوئے تھے، وہ بھی خرید لیا جائے۔ اور اس میں شفاخانہ یا مدرسہ جاری کر دیا جائے۔

(۵) پایۂ تخت میں ایک عظیم الشان شفاخانہ یا یتیم خانہ قائم کیا جائے اور مرحوم کے نام پر اس کا نام رکھا جائے۔

تعزیت کے پیغام

بیگم زغلول کے نام دنیا بھر سے تعزیت کے پیغام آرہے ہیں بڑے بڑے آدمیوں اور بادشاہوں نے تار بھیجے ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا پیغام سلطان ابن سعود اور ان کے بیٹے امیر فیصل کا تھا۔ ان دونوں نے نہایت رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔ اور اس حادثہ کو تمام مشرق کے لئے عظیم خسارہ بتایا ہے۔ اگر میں ان تمام پیغاموں کا ذکر کروں تو چٹھی بہت طویل ہو جائے گی۔

یورپین اخبارات کے پیغام

یہ معلوم کرنا نہایت اہم ہے کہ زغلول پاشا کی وفات کو یورپ کے اخبارات نے کس نظر سے دیکھا ہے۔۔؟ خصوصاً برطانوی اخباروں نے کس طرح اظہار خیال کیا ہے؟

ٹائمس آف لنڈن لکھتا ہے:-

زغلول پاشا نے معاملات مصر میں جو حصہ لیا، اس کے متعلق تاریخ کا فیصلہ کچھ ہی ہو، لیکن یہ یقینی ہے کہ تاریخ انہیں مصر جدید کا سب سے بڑا آدمی شمار کرے گی، وہ اپنے اندر ایک حیرت انگیز زندہ روح رکھتے تھے اگرچہ زیادہ مضبوط

جسم کے مالک نہ تھے۔ وہ اپنی جسمانی بناوٹ اور شکل و صورت میں مصری "فلاح" (کسان) کا مکمل نمونہ تھے۔ زبردست شخصیت اور اخلاق رکھتے تھے۔ خارق عادت شجاعت، شدید صراحت، ان کی نمایاں صفت تھی۔ بڑی قوت استدلال، سکت حجت حاضر جوابی، خوش گفتاری اور حیرت انگیز خطابت نے انہیں نہایت ممتاز کر دیا تھا۔ محمد علی پاشا اول خدیو مصر کے عہد سے آج تک کسی نے بھی فرعون کی سرزمین میں اپنی مقبولیت، اخلاقی اقتدار، اور عام محبوبیت حاصل نہیں کی۔ جتنی زغلول پاشا نے حاصل کی۔ اسی قدر نہیں بلکہ مصر جدید کی تاریخ میں وہ پہلے سیاسی رہنما ہیں۔ جنہوں نے قوم کے دل و دماغ، دونوں پر یکساں اثر ڈالا۔ اور ملک کی سیاسی تربیت کی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مشرقی رہنما، مغربی رہنماؤں کے مقابلے میں جلد بوڑھے ہو کر معطل ہو جاتے ہیں، لیکن سعد زغلول، اس کلیہ سے مستثنیٰ ہیں وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک چست و چالاک رہے اور سخت سے سخت دماغی محنت انجام دیتے رہے۔ تاریخ میں بہت کم انتہا پسند انقلابیوں کے نام ملتے ہیں جو ۵۰ سال کی عمر کے بعد بھی اپنا سیاسی اقتدار اور مقبولیت برقرار رکھ سکے ہوں۔ لیکن زغلول پاشا اپنے آخری وقت تک محبوب و مقبول رہے۔ ان کی عمر جتنی زیادہ ہوتی گئی اسی قدر زیادہ ان میں سیاسی جوش اور انقلابی روح بیدار ہوتی گئی۔ برطانیہ نے زغلول کو جلا وطن کیا تھا۔ لیکن اس عظیم انسان کے دل میں اس وجہ سے کوئی بغض پیدا نہیں ہوا۔ برطانیہ نے دیکھ لیا تھا کہ یہ اس کا ایک ایسا دشمن ہے، جو خندہ پیشانی سے ہر طرح کی ضربیں برداشت کر سکتا۔ اور پورے تواس سے ان کا

جواب دے سکتا ہے۔ کوئی شخص بھی اس "فلاح" کی شجاعت پر حیرت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس نے بے شمار مخالف قوتوں سے مقابلہ کیا۔ اور سب کو بالآخر اپنے ارادے کے سامنے جھکا لیا!"

ڈیلی نیوز لکھتا ہے:۔

"زغلول، سال ہا سال سے مصر کا معبود تھا۔ سیاسی جنگ میں اس کی شجاعت و بسالت بے نظیر تھی۔ وہ اپنی قوم کو کامل خود مختاری کی طرف لے جا رہا تھا، لارڈ کرزن نے ایک مرتبہ کہا تھا: "زغلول" شورش کا غیر مسئول علم بردار ہے! لیکن کچھ ہو، وہ اپنے ملک کی آزادی چاہتا اور انگریزوں کو وہاں سے نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ مصریوں کے دل میں اس کی عزت بے حساب تھی۔ وہ ہمارا شریف اور بہادر دشمن تھا!"

مینچسٹر گارڈن لکھتا ہے:۔

"زغلول پاشا، تمام مصریوں میں ایک آدمی تھا۔ اس کا ظاہر و باطن ایک تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے ۳ مرتبہ جلا وطن ہونا پڑا۔ انگریزوں نے بہت کوشش کی کہ اسے جاہ و منصب کا لالچ دے کر ملالیں، مگر اس نے ہمیشہ انکار کیا، اور کامل خود مختاری کے سوا کبھی کچھ قبول کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ سعد پاشا کی ذہانت، اخلاق، خوش مزاجی، ایسی تھی، جس کی نظیر مغلوب قوموں کے رہنماؤں میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔"

یہ انگلستان کے متعصب سے متعصب اخبارات کے خیالات ہیں لیبر پارٹی کے

اخبارات نے تو اس سے بہت زیادہ لکھا ہے۔ اختصار کے خیال سے ہم ان کا ذکر نہیں کر سکتے۔ یہ تمام رائیں تار کے ذریعہ قاہرہ کے اخبارات میں پہنچی ہیں اور ابھی ان کا سلسلہ برابر جاری ہے۔

اسی طرح فرانسیسی اخبارات نے بھی طویل و عریض مضمون شائع کئے ہیں اور مرحوم کی بہت تعریف کی ہے۔

نیم سرکاری اخبار "طان" لکھتا ہے :-

"سعد پاشا مصر کے اس وقت سب سے بڑے آدمی تھے۔ ان کی زندگی کا اکثر حصہ اپنے ملک کے لئے آزادی حاصل کرنے کی جد و جہد میں گزرا۔ وہ دنیا بھر کی نظروں میں معزز و محترم تھے"

"ایکو ڈی باری" لکھتا ہے :-

"زغلول مصر کا عظیم آدمی تھا۔ آزادی کا علم بردار تھا۔ مصر میں اس سے بڑا کوئی آدمی موجود نہ تھا"

اخبار "دیبا" لکھتا ہے :-

"سعد کی موت نے مصر کو اپنے سب سے بڑے رہنما سے محروم کر دیا۔ اس کی شخصیت بہت ہی عظیم تھی"

سعد پاشا کی زندگی پر ایک نظر

وہ ۱۸۶۰ء میں پیدا ہوئے۔

"۵ ر اکتوبر ۱۸۱۸ء کو شیخ سعد زغلول ازہری طالب علم کی سرکاری اخبار الوقائع المصریہ کے ادارۂ تحریر میں تقرری ہوئی ــ ۸۰۰ قرش (ایک قرش ۲ ء کا ہوتا ہے) ماہوار تنخواہ مقرر ہوئی تھی۔ یہ طالب علم، خوش اطوار ہے۔ شیخ محمد عبدہ نے اس کے چال چلن کی تصدیق کی ہے"۔ یہ عبارت ایک سرکاری فرمان سے اخذ کی گئی ہے۔ اس وقت مرحوم، ازہر کے طالب علم تھے، اور شیخ سعد زغلول کہلاتے تھے۔

یکم فروری ۱۸۸۲ء کو ان کی تنخواہ ۹۳۳ قرش ہو گئی۔

۳ ر مئی ۱۸۸۲ء کو "سعد آفندی زغلول" کا تبادلہ وزارت داخلیہ کے محکمہ میں ہو گیا۔ اور تنخواہ ۱۵ پونڈ مقرر ہوئی۔

۶ ر ستمبر ۱۸۸۲ء کو "جیزہ" کی کمشنری میں محافظ دفتر کاغذات سرکاری مقرر ہوئے۔

۲۷ ر جون ۱۸۹۲ء میں ۵۴ پونڈ تنخواہ پر درجہ دوم کے مجسٹریٹ مقرر ہوئے۔

یکم فروری ۱۸۹۴ء میں تنخواہ ۵۵ پونڈ ہو گئی۔

یکم جنوری ۱۸۹۷ء میں تنخواہ ۶۰ پونڈ قرار پائی۔

۸ ر اپریل ۱۸۹۹ء میں انہیں پہلا سرکاری تمغہ دیا گیا۔

۱۷ ر جنوری ۱۹۰۴ء میں انہیں تیسرا نشان مجیدی عنایت ہوا۔

یکم جنوری ۱۹۰۶ء میں ان کی سالانہ تنخواہ ایک ہزار پونڈ ہو گئی۔

۲۸ر اکتوبر ۱۹۰۶ء میں "سعد زغلول بک" وزیر تعلیم مقرر ہوئے۔

۱۷ر نومبر ۱۹۰۶ء میں "پاشا" کا خطاب ملا۔

۱۸ر جنوری ۱۹۰۸ء میں "مجیدی اول" کا تمغہ ملا۔

۲۳ر فروری ۱۹۱۰ء میں محکمۂ عدالت کے وزیر مقرر ہوئے۔

۲۷ر جنوری ۱۹۲۴ء میں وزیراعظم مقرر ہوئے۔

۲۳ر مارچ ۱۹۲۵ء میں پہلی مرتبہ پارلیمنٹ کے صدر مقرر ہوئے۔

۱۰ر جون ۱۹۲۶ء میں دوسری مرتبہ پارلیمنٹ کے صدر مقرر ہوئے۔

۲۳ر اگست ۱۹۲۷ء میں فوت ہوگئے۔

مرحوم سعد پاشا زغلول کی بلیغ تقریریں

مرحوم احمد سعد پاشا زغلول کی فصاحت و بلاغت اور قوت خطابت مشہور عالم ہے۔ ان کی مقبولیت اور سیاسی زعامت کی کامیابی میں ایک بڑا راز ان کی یہی ساحرانہ خطابت ہے۔ ہم چاہتے ہیں۔ ان کی بعض مشہور تقریروں کے اقتباسات وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہیں۔ ادبی خوبیوں کے علاوہ ان سے مرحوم کا سیاسی مذہب اور فکری رحجان بھی معلوم ہوگا۔

شہیدانِ وطن کی یاد

ہمہ تن خشوع ہو کر ان پاک روحوں کی طرف، بہادروں کی روحوں کی طرف

متوجہ ہوتا ہوں، جنھوں نے حق کا اعلان کیا۔ حالانکہ حق کا اعلان مصر میں سب سے بڑا جرم تھا۔

"وہ حق کا ڈنکا بجاتے آگے بڑھے۔ ان کی بے لاگ شجاعت نے ہمیں سُرخرو کردیا۔ سب کو وطن کے احترام پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنا فرض انجام دے چکے۔ اب وہ آرام سے اپنی قبروں میں سوئیں۔ آزادی کی سُہانی صبح ان کے خون سے نہائی ہوئی، غلامی کی ظلمت چاک کر کے نکل آئی۔ اللہ ان کی قبریں روشن کرے۔ فردوس بریں میں انہیں اتارے۔ ہمارے عمل سے ان روحوں کو خوش کرے۔"

نوجوان

"میری قوم کی جوانی پر خدا کا سایہ! نوجوانوں نے جوانی کے ان تمام خزانوں کے منہ کھول دئے، جو ان کے سینوں میں بند تھے۔ پورے ملک کو خوشی اور خودداری سے لبریز کر دیا۔ دلوں میں عظمت پیدا کی، سروں میں حکمت اتاری، جسموں میں نظام قائم کر دیا۔ نوجوان ہی ہماری تحریک کا اصلی ستون ہیں۔ مصر کے لئے روشنی کا مینار ہیں۔ مستقبل انہیں کے ہاتھ میں ہے۔ اور نوجوان ہاتھوں کی قوت معلوم ہے۔"

علمائے دین

"میں علماء اسلام اور مسیحی قسیسوں کا شکرگزار ہوں۔ انہوں نے متحد ہو

کر دشمن کی سب بڑی حجت باطل کر دی۔ تمام اختلافات دور کر دئے، اور ثابت کر دیا کہ سب دین اپنی غرض میں ایک ہیں۔ سب وطن کی مدافعت فرض قرار دیتے ہیں۔ سب کا تعلق، خالق ارض وسما کی عبادت سے ہے۔ سب وطنی مصلحت میں مخلوق کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں۔"

اصُول نہ کہ اشخاص

"سعد اور اس کے رفیق، تم میں انبیاء نہیں ہیں جنہوں نے معجزے دکھائے۔ اولیاء نہیں ہیں، جنہوں نے کرامتیں دکھائی ہیں۔ وہ تمہارے ہی افراد ہیں تمہارے اصول کے خدمت گزار ہیں۔ تمہارے ہی آدمی ہیں، تمہارے شعور کا انہوں نے احساس کیا۔ اور تمہارے اصول سے لبریز ہو گئے۔ چنانچہ وہ ان کی خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے۔ پس ہمارے لئے کوئی فخر نہیں۔ اور اگر ہے۔ تو وہ سب کا فخر ہے۔"

بلاشبہ میں نے کچھ خدمت کی ہے۔ لیکن میں نے کوئی قربانی نہیں کی۔ کیونکہ میں بے روزگار تھا۔ البتہ میرے ساتھیوں نے قربانیاں کی ہیں۔ انہوں نے اپنے منصب اور عہدے چھوڑے۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد تک کی جدائی گوارا کی۔ اور آپ جانتے ہیں کہ میرے کوئی اولاد بھی نہیں (اس پر حاضرین پکارے۔ ہم سب آپ کی اولاد ہیں) بلاشبہ تم سب میری اولاد ہو۔ لیکن میں خوب جانتا ہوں۔ کہ یہ تمام اعزاز اشخاص کے لئے نہیں، اصول کے لئے ہے۔ وہ اصول سعد اور سعد کے

رفقاء سے کہیں بلند ہے۔"

اتحاد

میری نظر میں سب سے بڑی اور محبوب چیز مسلمانوں اور قبطیوں کا اتحاد ہے۔ یہ علم جو اس مبارک اتحاد کا نشان ہے، مجھے دنیا اور دنیا کی سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ علم میرے ہاتھ میں دے دو۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اپنی پوری قوت سے اس کی حفاظت کروں گا۔ اور زندگی کے آخری لمحے تک اسے بلند رکھوں گا۔ "مسلمان" اور "عیسائی"۔ لیکن میں مسلمان اور عیسائی نہیں چاہتا۔ مصر میں صرف ایک قوم ہونا چاہئے۔ اور وہ مصری قوم ہے۔"

وکالت

وکلاء کے ایک جلسے میں تقریر کرتے ہوئے مرحوم نے کہا:۔

"میری خدمتوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ میرے لئے ان خدمتوں پر فخر کرنا روا نہیں ہے۔ لیکن میں آپ کی اجازت سے صرف اس بات پر فخر کرنا چاہتا ہوں کہ میں وکالت کے پیشے میں داخل ہوا۔ اور اس کی خدمت کی "ہاں" میں اس خدمت پر بہت زیادہ فخر کرتا ہوں۔ مجھے کوئی انانیت کا الزام نہ دے۔ کیونکہ میں جانتا ہوں اس زمانے میں اس پیشہ کا کیا حال تھا"؟

"میں نے وکالت کا پیشہ اس وقت اختیار کیا جب یہ پیشہ معزز نہ تھا۔ جیسا اس وقت ہے۔ بلکہ وہ حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے آدمی بھی حقیر سمجھے جاتے تھے۔ یہ پیشہ اصل میں جس قدر شریف تھا۔ ہمارے ملک میں اسی قدر ذلیل ہوگیا تھا۔ وکیل اور دغاباز، یہ دونوں لفظ ہم معنی سمجھے جاتے تھے۔ اونچے خاندان کا کوئی رکن بھی اس میں داخل نہیں ہوتا تھا اور سچ یہ ہے کہ اس وقت خود وکلا کو بھی اپنی عزتِ نفس کا کوئی خیال نہ تھا۔"

"لیکن یہ سب جانتے ہوئے بھی میں اس پیشہ میں کود آیا۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی اخلاقی شجاعت کا کام تھا۔ میں سنا کرتا تھا کہ لوگ وکیل اس لئے بنتے ہیں کہ مکروفریب کی راہوں سے دولت کمائیں۔ میں نے کہا لیکن میں اس لئے وکیل بنوں گا کہ حق وعدالت کی خدمت کرسکوں۔"

یہ اس وقت کی بات ہے جب وکیل، حاکم عدالت کے رحم پر ہوتا تھا۔ اس کی ذراسی ناراضی بھی، وکیل کو اپنی کمائی سے محروم کردیتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں ایک مقدمہ پر بحث کررہا تھا۔ سرکاری وکیل نے کہا آج پیشی بڑھا دی جائے۔ میں نے اعتراض کیا۔" مقدمہ کا التواء ناروا ہے، کیونکہ ملزموں کو قیدخانے میں بلاسبب رکھنا ناجائز ہے۔ حاکم خفا ہوگیا۔" فوراً اپنے الفاظ واپس لو" حاکم نے کہا۔" عدالت کے لئے کوئی بات بھی ناروا اور ناجائز نہیں"۔ لیکن میں نے الفاظ واپس لینے سے انکار کیا اور سخت صورت حال کا مقابلہ کیا۔"

"اسی طرح کے بہت سے واقعات پیش آتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ زمانہ آگیا۔ جب یہ پیشہ معزز ہوگیا اور حکام وکلاء کی دوستی پر فخر کرنے لگے۔"

قومی نگرانی کے حدود

ہم قوم کے نمائندے ہیں۔ قوم کو ہماری نگرانی کا حق ہے۔ قوم کا فرض ہے کہ وہ اپنا مطالبہ ہمیں بتائے۔ اس نے یہ مطالبہ ہمیں بتا دیا ہے کہ "کامل آزادی" اب ہم کوشش کرتے ہیں۔ قوم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ کوشش کی راہیں بھی ہمارے لئے مقرر کرے۔ قدم قدم پر ہم سے بازپرس کرے۔ اگر ہم کسی سے گفتگو کریں تو ہم سے روداد طلب کرے۔ اگر ہم کہیں جائیں۔ تو ہم سے وجہ دریافت کرے۔ قوم کو چاہئے کہ خاموشی سے ہماری کوششیں دیکھے۔ جب ہم اس کے سامنے اپنی کوشش کے نتائج پیش کریں۔ تو بلاشبہ اسے حق ہے کہ ہماری تجویزیں خوب جانچے۔ اگر اس کی پسند کے مطابق نہ ہوں تو ٹھکرا دے۔ ہمیں ہرگز کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

آزادی کی نعمت

ہم دنیا کی ہر نعمت سے محروم ہو جانے پر تیار ہیں۔ سب آرام ہم سے چھین لو، ہمارا مال و دولت بھی ضبط کرلو۔ ہم اس سب پر صبر کرلیں گے، مگر اے ہمیں غلام بنانے والو! یاد رکھو، ہم آزادی سے ہرگز دست بردار نہ ہوں گے، آزادی خدا کی سب سے بڑی نعمت ہے۔ اس سے محرومی خود زندگی سے محرومی ہے۔

قومی وحدت

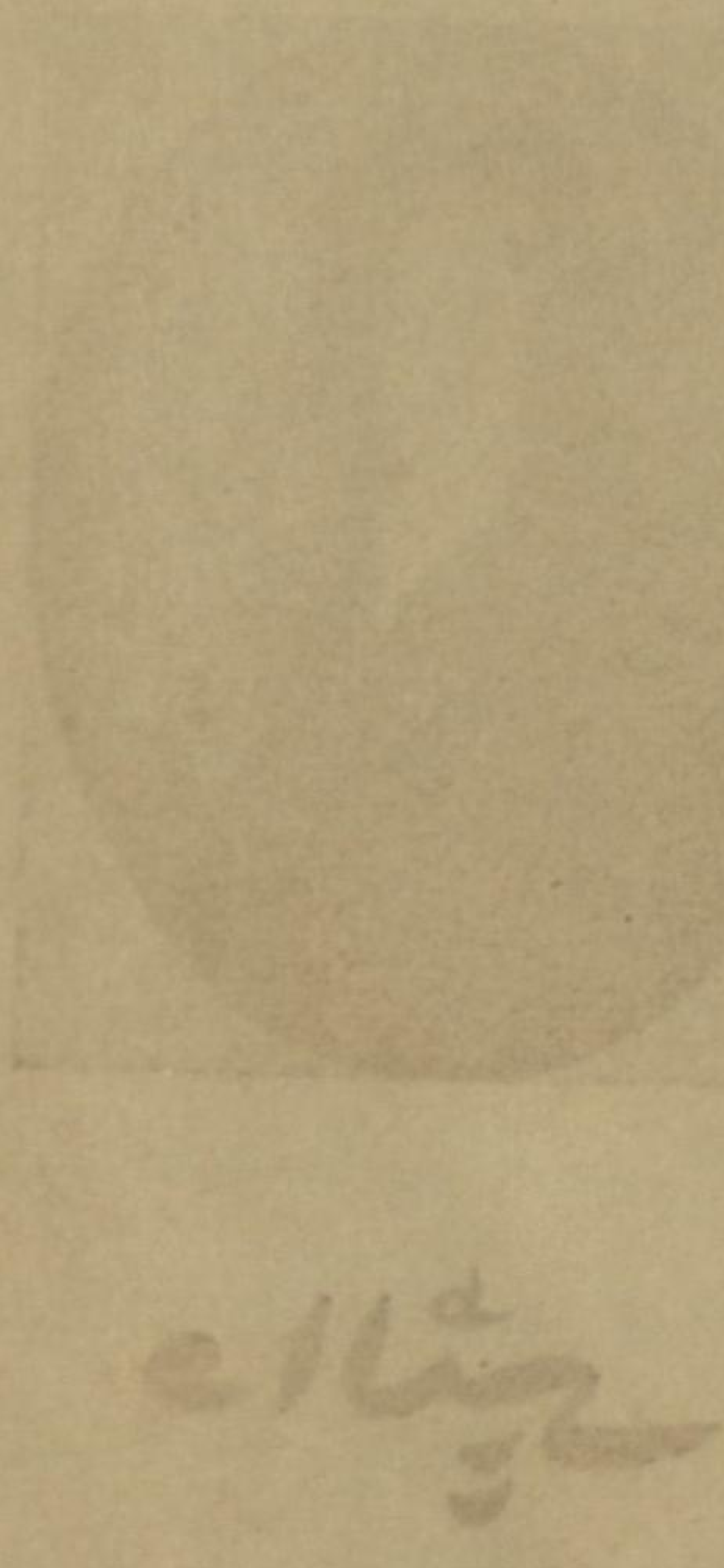
"قوم اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانوں کا ایک مجموعہ ہے۔ وہ مجموعہ جس کی مصلحت ایک ہے، جس کا شعور ایک ہے، جس کی آرزو ایک ہے، ہماری قوم کی اس وقت آرزو کیا ہے ——— کامل خود مختاری!"

ہماری قومی وحدت مضبوط بنیاد پر قائم ہے۔ اس میں نہ فرقے ہیں، نہ درجے وہ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ "باشاؤں" (امیروں) کا گروہ پوری قوم پر حاوی ہونا چاہتا ہے۔ ہمارے ملک میں نہ "باشاؤں" کا کوئی خاص گروہ ہے نہ "فلاحین" (کسان) کا۔ ہم سب "باشا" بھی ہو سکتے ہیں۔ اور "فلاح" بھی ہو سکتے ہیں۔ میرے اپنے خاندان کے اکثر افراد فلاح ہیں۔ لیکن میں سعد زغلول باشا ہوں۔

"وہ جھوٹے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارے اندر دینی فرقے موجود ہیں۔ ممکن ہے پہلے کبھی ہوں۔ لیکن اب کوئی فرقہ نہیں ہے۔ اور اگر کوئی ہے تو وہ ایک ہی فرقہ ہے، یعنی مصری قوم۔ جب سے جدید بیداری کا سورج طلوع ہوا ہے۔ ہلال اور صلیب نے ہمیشہ کے لئے معانقہ کر لیا ہے۔ یہ معانقہ صرف مسلمان اور قبطی کا معانقہ نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کا دنیا بھر کی قوموں اور مذہبوں سے اتحاد کا نشان ہے۔ ہم متعصب نہیں ہیں ہم شیطان کے پجاری نہیں ہیں جو انسانوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔ ہم خدا کے پرستار ہیں جو انسانوں میں محبت کا رشتہ پیدا کرتا ہے۔"



والٹیر



والٹیر

ایک دن والٹیر مشہور رقاصہ ردمانیل کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھا تھا۔ رقاصہ تھیٹر جا رہی تھی۔ جہاں اُسے والٹیر کے شہرۂ آفاق ڈرامہ "میرد پ" کی مشق کرنا تھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ کہنے لگی۔ "کامیابی کے ساتھ یہ ڈراما اور اس کے دقیق جذبات دکھانے کے لئے ضروری ہے کہ میرے جسم میں شیطان حلول کر جائے"۔

"سچ ہے بیگم! ہر فن میں کامیابی اسی پر موقوف ہے کہ شیطان جسم میں حلول کر جائے" والٹیر کا جواب تھا!

والٹیر کے تمام دُشمنوں نے خصوصاً کلیسائی حریفوں نے بیک زبان کہا ہے کہ شیطان اس کے اندر حلول کیے تھا۔ چنانچہ سینٹ بوف کا قول ہے۔ "ابلیس اُس کے جسم میں تھا"۔ ردمیسٹر کہتا ہے:" یہ شخص جہنم کی تمام قوتوں اور ہولناکیوں کا مالک تھا"۔

دراصل والٹیر اپنے وقت کا پورا آدمی تھا۔ یورپ کی اٹھارہویں صدی کی ادبیات کی

سچی تصویر اس فلسفی شاعر میں ہم دیکھ سکتے ہیں ۔ اس کی تصانیف میں اس کی جملہ بھلائیاں اور برائیاں، دونوں جمع ہو گئی ہیں ۔ کبھی وہ نہایت مزموم، کج خلق، بد اطوار، فحاش، بے اصول، مفرط اور کمینہ نظر آتا ہے ۔ کبھی از حد لطیف، مہذب، سنجیدہ، با اصول، فیاض اور دوستوں پر جان و مال قربان کرنے پر تلا ہے ۔ کبھی دشمنوں کو پاؤں سے روند ڈالنے پر اڑا ہے ۔ والٹیئر ایسی ہی متناقص صفات و اخلاق کا مجموعہ ہے !

لیکن یہ صفتیں اس کی شخصیت کی اصلی بنیادیں نہیں ہیں ۔ اس کی شخصیت کے ستون جس چٹان پر قائم تھے، وہ اس کی اعلیٰ دماغی قابلیت اور حیرت انگیز ذہانت تھی ۔ ثبوت کے لیے کسی تاریخی شہادت کی ضرورت نہیں ۔ اس کی کتابیں خود سب سے بڑی شہادت ہیں ۔ ننانوے ضخیم جلدیں اس کی یادگار ہیں ۔ ان کا ہر صفحہ روشنی کے حرفوں میں لکھا ہے ۔ ہر سطر اپنی جگہ پر ایک کامل سحر ہے ۔ اتنی بڑی، اتنی کثیر، اتنی متنوع کتابیں کم لوگوں نے چھوڑی ہیں ۔ وہ معلومات و مباحث کی وسعت و تنوع کے لحاظ سے انسائیکلوپیڈیا کا حکم رکھتی ہیں ۔ تاہم حشو و زوائد بہت کم ہیں ۔

خود والٹیئر کا قول ہے "میرا پیشہ یہ ہے کہ جو کچھ میرے ذہن میں آئے، اسے کہہ ڈالوں" ۔ زندگی بھر اس نے اسی پر عمل کیا ۔ لیکن اس کے ذہن میں ہمیشہ وہی آتا تھا جو کہنے کے لائق ہوتا تھا ۔ لغو افکار سے اس کا دماغ بالاتر تھا ۔ اس کی سب سے بڑی مہارت یہ تھی کہ ہر خیال کو ایسے پیرایہ میں ادا کر دیتا تھا کہ سامعین وجد کرنے لگتے تھے !

والٹیئر کی سب سے زیادہ مؤثر، دلچسپ اور عجیب تحریریں وہ ہیں، جو اس نے مسیحی کلیسا کے خلاف لکھی ہیں ۔ معلوم ہے کہ اس نے مسیحی کلیسا کے جمود اور تعصب کے خلاف

(خود اس کے لفظوں میں) جنگ مقدس (کروسیڈ) کا اعلان کیا تھا۔ ان تحریروں میں اس نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے ہیں۔ لفظ اور سطریں نہیں ہیں، جرّار فوجیں ہیں جو حملہ آور ہو رہی ہیں۔ درحقیقت مسیحی کلیسا کے ہزار سالہ تختِ حکومت کے پائے اسی کے نوکِ قلم سے ٹوٹے، اور اس طرح ٹوٹے کہ پھر کسی طرح بھی استوار نہ ہو سکے!

والٹیر کی شہرت صرف اس کی کتابوں اور قصیدوں سے ہی نہیں ہوئی بلکہ وہ بہت بڑا مقرر اور لسان بھی تھا۔ انہیں مختلف قابلیتوں کے مجموعہ نے اسے اپنے زمانہ کا سب سے بڑا آدمی بنا دیا!

والٹیر غضب کا محنتی تھا۔ کام سے کبھی نہیں تھکتا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اتنا بڑا علمی ذخیرہ چھوڑ گیا جتنا کہ ایکے کسی ہمعصر کے امکان میں نہ تھا۔ اس کی غیر معمولی چستی کے ثبوت میں خود اُس کے بہت سے اقوال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ وہ کہتا ہے:

"سستی اور عدم ایک چیز ہے"

ایک اور جگہ لکھتا ہے:۔

"تمام آدمی اچھے ہیں، بجز اُن کے، جن کے پاس کرنے کے لئے کوئی کام نہیں!"

اس کے سیکرٹری کا بیان ہے:۔

والٹیر بڑا سخی تھا۔ صرف اپنے وقت میں بخل کرتا تھا۔ اُس کا مشہور مقولہ ہے:۔

"زندگی کے مصائب کم کرنے کے لئے نفس کو ہمیشہ زیادہ سے زیادہ کام میں مشغول رکھنا چاہیئے ... ... میری عمر جتنی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ محنت کی ضرورت کا اتنا ہی زیادہ یقین ہوتا جاتا ہے۔ جو شخص محنت کا عادی ہو جاتا ہے، اسے محنت میں اتنی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ زندگی کی تمام کلفتیں بھول جاتا ہے۔"

اس کا یہ قول ضرب المثل ہو گیا ہے:۔
"اگر خودکشی منظور نہیں ہے تو اپنے لئے کوئی کام پیدا کر لو" اسی جملہ سے لوگوں نے خیال کیا ہے۔ کہ اس کے دل میں خودکشی کا خیال پیدا ہوا کرتا تھا۔ اسی لئے وہ ہمیشہ کام میں منہمک رہتا تھا۔

اٹھارہویں صدی کی رُوح

وکٹر ہیوگو کا قول ہے:۔

"والٹیر اور اس کی روح کا سمجھ لینا پوری اٹھارویں صدی کی روح کا سمجھ لینا ہے":
اٹلی ایک بڑی تہذیب کا منبع تھا۔ جرمنی سے اصلاح دینی کا سرچشمہ پھوٹتا۔ لیکن فرانس؟ تو فرانس میں والٹیر تھا۔ والٹیر ایک پوری قوم تھا۔ انقلاب عظیم کی دعوت تھا۔ نہیں، سرتاپا انقلاب تھا۔ فرانس کا مشہور انقلاب، جس نے خون کی موجوں سے ایک نئی دنیا پیدا کر دی، والٹیر ہی کا ایک افسون حیات تھا۔ یہ شخص اپنے اندر سب کچھ رکھتا تھا۔ اُس میں "مونتین" کا شک تھا۔ "رابلیہ" کا تمسخر تھا۔ "لوتھر" کی حملہ آورانہ قوت تھی۔ اسی نے میرابو، مورات، ڈانٹن، روبسپیر، پیدا کئے تھے۔ اور وہ بارود بنائی تھی۔ جس سے انہوں نے دنیا کے تمام نظام ہائے قدیم کی عمارتیں بیک دفعہ ہوا میں اُڑا دیں!"

لامارٹین کہتا ہے:۔
اگر انسان کا عمل اس کی عظمت کا میزان ہے۔ تو بلاشک والٹیر موجودہ یورپ کا

سب سے بڑا کاتب تھا۔ قدرت نے اس کی عمر میں برکت دی۔ ۸۳ سال زندہ رہا۔ قدیم نظام کے مصائب معلوم کئے۔ اس کے خلاف جہاد کیا۔ اور جب مرا تو فتح مند تھا۔"

کسی مصنف کو بھی اپنے عہد میں اتنا اقتدار حاصل نہیں ہوا، جتنا والٹیر نے حاصل کیا تھا۔ تمام جہان اُس کا مخالف تھا۔ کلیسا جو اُس وقت تک سب سے بڑی قوت تھی، دشمن تھا۔ حکومت خون کی پیاسی تھی۔ اُسے قید کیا گیا۔ جلاوطن کیا گیا۔ اُس کی کتابیں ردی گئیں، جلائی گئیں۔ حتیٰ کہ چھاپنے، بیچنے اور پڑھنے والوں تک کو سزا دی گئی۔ مگر والٹیر کے عزم وہمت میں فرق نہ آیا۔ وہ تمام دشمنوں پر غالب آیا۔ تمام مشکلات پر فتح مند ہوا اس نے ہمیشہ حق وحقیقت کا اظہار کیا۔ اور بالآخر دنیا کی گردنیں اُس کے علمی وعقلی جبروت کے آگے جھک گئیں۔ یا تو اُسے ذلیل سمجھا جاتا تھا۔ یا پھر یہ ہوا۔ کہ بادشاہ، شہنشاہ اور روم کے پوپ تک اس کی خوشامدیں کرنے لگے۔ سب اُس کی ہیبت سے لرز اُٹھے، پاپاؤں کی روحانی گدی اور بادشاہوں کے زریں تخت ہلنے لگے۔ آدھی دنیا نے اس ساحر کے لئے اپنے کان کھول دئے۔ اور اُس کی زبان وقلم کا ہر لفظ باشندگانِ یورپ کے دلوں میں اتر گیا!

والٹیر ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا تھا۔ جس کی سب سے بڑی ضرورت تخریب اور شکست وریخت تھی۔ جرمنی کا نیٹشے کہتا ہے: "ہنسنے والے شیروں کے نمودار ہونے کی ضرورت ہے"۔ والٹیر نے یہ نہیں کہا۔ مگر وہ سچ مچ کے شیر کی طرح گرجتا اور ہنستا ہوا اُٹھا۔ اور قدیم نظام کی کہنہ عمارت ڈھادی۔ درحقیقت یورپ کی موجودہ بیداری اور تہذیب کا سہرا دو ہی آدمیوں کے سر ہے۔ والٹیر اور روسو انہی دونوں نے فرانس

کی تخم ریزی اور وہ سب کچھ مہیا کر دیا جس کی اس انقلاب میں ضرورت تھی۔ بدنصیب لوئی شانزدھم نے قتل ہونے سے چند دن پہلے قید خانہ میں والٹیر اور روسو کی کتابیں دیکھی تھیں۔ وہ بے اختیار چلا اُٹھا "انہی دو آدمیوں نے فرانس کو برباد کیا ہے"! ظاہر ہے کہ فرانس کی بربادی سے بدنصیب بادشاہ کا مقصود اپنے خاندان کی بربادی تھی۔ نپولین اعظم کہا کرتا تھا "بوربون (فرانس کا خاندانِ شاہی) اپنا تخت و تاج محفوظ رکھ سکتا تھا۔ اگر والٹیر اور روسو کا منہ بند کر دیتا" خود والٹیر کہتا ہے "کتابیں ہی قوموں پر حکومت کرتی ہیں"۔ اسی کا مقولہ ہے "دماغی تربیت سے بڑھ کر کوئی ذریعہ آزادی کا نہیں" ایک اور موقعہ پر اُس نے کہا "جب قوم سوچنے لگ جائے۔ تو پھر منزلِ مقصود سے اُسے روکنا ناممکن ہو جاتا ہے"۔ والٹیر کے ظہور کے ساتھ فرانس نے سوچنا شروع کیا۔ اور دنیا کی کوئی قوت بھی اُسے آگے بڑھنے سے روک نہ سکی۔

مختصر سوانح حیات

والٹیر کا اصلی نام "فرانسو ماری اورویہ" ہے۔ ۱۶۹۴ء میں پیرس میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ رجسٹرار تھا۔ اور ماں ایک شریف گھرانے کی خاتون تھی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ والٹیر نے اپنی غصہ والی طبیعت اپنے باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔ اور ذہانت ماں سے۔ والٹیر کے پیدا ہونے میں اس کی ماں کو اتنی تکلیف ہوئی کہ جانبر نہ ہو سکی۔ وہ خود بھی ازحد کمزور تھا۔ حتیٰ کہ اس کی دائی نے گود میں لیتے ہی کہدیا تھا "بچہ ایک دن سے زیادہ نہیں جئے گا" لیکن اُس کا اندازہ غلط تھا۔ وہ ۸۶ سال تک زندہ رہا۔ البتہ بیماریوں اور جسمانی

تکلیفوں میں ہمیشہ مبتلا رہا۔

والٹیر کا ایک بڑا بھائی بھی تھا۔ اس کا نام "ارمان تھا" لیکن وہ آزاد خیالی کے جرم میں کلیسا کے حکم سے قتل کر ڈالا گیا تھا۔ تو بعض دوستوں نے رائے دی۔ توبہ کر کے جان بچالے۔ لیکن یہ سُن کر وہ بہت غضب ناک ہو گیا۔ اس نے کہا: "دوستو! شکریہ! اگر تم خود پھانسی پر لٹکنا پسند نہیں کرتے۔ تو ان لوگوں کی راہ کیوں روکتے ہو جو پھانسی پانا پسند کرتے ہیں؟"

والٹیر کا باپ اپنے دونوں لڑکوں کی شکایت کیا کرتا تھا: "خدا نے مجھے دو پاگل بیٹے دئے ہیں:۔ ایک کو نثر کا جنون ہے، دوسرے کو نظم کا" والٹیر نے شعر کہنا اُس وقت سے شروع کیا۔ جبکہ وہ اپنا نام بھی صحیح طور پر نہیں لکھ سکتا تھا۔ اُس کا باپ علمی زندگی کا عادی تھا۔ اُس نے اپنے لڑکے کی یہ حالت دیکھکر افسوس کے ساتھ یقین کر لیا کہ یہ بالکل ناکارہ نکلے گا۔ اُسے کیا معلوم تھا، ایک دن اُس کا یہی "ناکارہ" تمام یورپ کا سب سے بڑا اہلِ قلم تسلیم کیا جائے گا!

والٹیر کی ماں کے انتقال کے بعد اُس کا خاندان پیرس چھوڑ کر دیہات میں جا بسا۔ یہاں ایک دولت مند فاحشہ نے والٹیر کو دیکھا۔ اور اُس میں آثارِ ذہانت ونجابت پائے۔ چنانچہ مرنے سے پہلے وہ یہ نیک کام کر گئی کہ دو ہزار فرنک والٹیر کو ہبہ کر دئے تاکہ "اس روپیہ سے اُسے کتابیں خرید دی جائیں"

والٹیر کو ان کتابوں سے بڑا نفع ہُوا۔ وہ عمر بھر اس آبرو باختہ عورت کا احسانمند رہا۔ اس کے بعد ایک راہب کو اُس سے محبت ہو گئی۔ لیکن یہ راہب دراصل

ملحد تھا۔ اس نے اُسے شک والحاد کی تلقین کی، اور کلیسا کی طرف سے نفرت وانکار دل نشین کر دیا۔

اس کے بعد وہ پادریوں کے مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لئے داخل کیا گیا یہاں اس نے فنِ مناظرہ اور علمِ کلام سیکھا۔ اس وقت بڑا علمی کمال یہ سمجھا جاتا تھا کہ ایک ہی مسئلہ کو بہ زورِ جدل دو متناقض پہلوؤں سے ثابت کر دیا جاتے۔ والٹیر نے اس فن میں کمال حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کسی مسئلہ پر بھی اُسے یقین باقی نہ رہا۔ مدرسہ میں وہ بڑا محنتی طالب علم مشہور رہا۔ حتیٰ کہ فرصت کے اوقات میں بھی جبکہ اور لڑکے کھیل کود میں مصروف ہوتے، وہ اساتذہ سے لاہوتی مسائل پر بحث کر کیا کرتا۔ اپنی طالب علمانہ زندگی کے متعلق وہ کہا کرتا تھا: "پادریوں نے مجھے لاطینی زبان اور بہت سی بے ہودہ بکواس سکھا دی ہے!"

تعلیم ختم کرنے کے بعد اُسے علمی دنیا کی طرف توجہ ہوئی۔ اور اپنے لئے کوئی پیشہ منتخب کرنا چاہا۔ اس نے اپنے باپ سے بلا پس وپیش کہدیا: "میں شعروادب کو اپنا پیشہ بناؤں گا۔" باپ بہت خفا ہُوا۔ اور بہت سمجھایا۔ مگر اُس نے ایک نہ سنی۔ اور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ لطف یہ ہے کہ اس پیشہ کے متعلق خود اُس کی رائے یہ تھی: "شعروادب اُن لوگوں کا مشغلہ ہے جو اجتماعی زندگی میں بے فائدہ بننا اور اپنے عزیزوں اور دوستوں کے سر پر بوجھ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا پیشہ ہے، جو بھوکوں مرجانا پسند کرتے ہیں۔"

۲۱ برس کی عمر تک والٹیر نے اپنے تئیں رندی وعیاشی کے لئے وقف کر رکھا تھا

راتیں باہر گزارتا تھا، اور دن گھر پر:-

"ہمہ شب شراب خوردن ہمہ روز خواب کردن"!

اُس کے والد کو اس تھنک سے بڑی تکلیف تھی۔ اُس نے لاکھ کوشش کی مگر صلاح کی کوئی صورت نہ نکلی۔ آخر اپنے ایک سخت گیر رشتہ دار کے ہاں بھیج دیا۔ شروع میں تو اس نئے مربی نے بڑی سختی کی۔ لیکن پھر اس کی غیر معمولی قابلیت و ذہانت دیکھ کر آزاد چھوڑ دیا۔ والد کو معلوم ہوا تو اس نے واپس بلا لیا۔ اور ہالینڈ میں فرانسیسی سفیر کے حوالہ کر دیا کہ اپنی نگرانی میں رکھے۔ یہیں ہالینڈ کے پائے تخت لاہائی میں والٹیر نے ایک دوشیزہ سے عشق کیا۔ لیکن راز جلد کھل گیا۔ اور حضرت کو ہزاروں حسرتوں کے ساتھ بھاگنا پڑا۔ یہ اُس کا پہلا عشق تھا۔ اس لئے عمر بھر اس کی چبھن دل میں باقی رہی"!

۱۷۲۵ء میں والٹیر اپنے والد سے علیحدہ ہو کر پیرس پہنچا۔ اسی زمانہ میں لوئی چہاردہم نے انتقال کیا۔ اور لوئی پانزدہم تخت نشین ہوا۔ بادشاہ کمسن تھا۔ اس لئے سلطنت کی باگیں اس کے مربی فلیپ ڈورلیں کے ہاتھوں میں آگئیں۔ یہ شخص کم ہمت اور ضعیف الارادہ تھا۔ ملک میں بدامنی پھیل گئی۔ پیرس اس کا مرکز تھا۔ والٹیر شورش پسندوں میں داخل ہو گیا۔ اور اپنی بے باقی اور جرأت کی وجہ سے بہت جلد ممتاز جگہ حاصل کر لی۔

اس کی جرأت کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ نائبِ سلطنت نے کفایت شعاری کے خیال سے شاہی اصطبل کے آدھے گھوڑے بیچ ڈالنے کا حکم دیا تھا۔ اس پر والٹیر نے ایک مضمون میں لکھا:- "کاش نائبِ سلطنت آدھے گدھوں کی فروخت کا بھی حکم صادر کر دیتے جو حکومت کی اونچی کرسیوں پر بیٹھے ہیں"!

حکام کی نظر سے یہ مضمون گزرا تو سخت برہم ہوئے۔ پھر نائب سلطنت کی ہجو میں دو قصیدے شائع ہوئے۔ اور خیال کیا گیا کہ والٹیر نے ہی لکھے ہیں۔ اب پوری حکومت اس کی دشمن ہو گئی۔ ایک دن کسی تفریح گاہ میں نائب سلطنت نے والٹیر کو دیکھا۔ اور بلا کر کہا "میں تم سے شرط باندھتا ہوں کہ عنقریب تمہیں ایک ایسی جگہ بھیج دوں گا۔ جسے تمہاری ان آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھا ہے"! والٹیر نے تمسخر سے سوال کیا" وہ کون جگہ ہو سکتی ہے"؛ نائب نے کہا باسٹل کی تاریک کوٹھڑیاں"!

اس گفتگو پر پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ والٹیر باسٹل کے خوف ناک قید خانہ میں بند تھا۔ یہ واقعہ ۱۷۱۷ء کا ہے۔ کاش اس وقت حکومت کو معلوم ہوتا کہ ایک دن یہی باسٹل والٹیر کے پیدا کردہ انقلاب کے ہاتھوں منہدم ہو کر رہے گا"!

اس وقت تک والٹیر اپنے اصلی نام "فرانسوا ماری اروہ یہ" سے مشہور تھا۔ لیکن قید ہونے کے بعد آئندہ حکومت کے شکنجہ سے بچنے کے لئے ایک فرضی نام اختیار کر لیا۔ جو والٹیر تھا۔ یہ فرضی نام اس درجہ مشہور ہوا کہ آج تاریخ کے سوا کہیں بھی اس کا اصلی نام نہیں مل سکتا۔

قید خانہ میں اس نے بڑی ہمت و جرأت سے کام لیا۔ اور اپنی شہرہ آفاق کتاب "ہنریاڈ" تصنیف کی۔ یہ دراصل ہنری چہارم کا قصہ ہے۔ جو پہلے پروٹسٹنٹ ہوا تھا۔ پھر دوبارہ کیتھولک ہو گیا۔ اور آخر کار قتل کیا گیا"!

قید خانہ میں وہ گیارہ مہینے رہا۔ اس اثنا میں اسے سخت جسمانی تکلیفیں دی گئیں۔ لیکن بعد میں خود نائب سلطنت کو رحم آ گیا۔ عزت کے ساتھ رہا کر دیا گیا۔ اور سالانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔ والٹر کی شوخ طبعی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس نے نائب سلطنت کو

شکریہ کا خط ان الفاظ میں لکھا تھا:۔

"اعلیٰ حضرت نے میرے رزق کا جو اہتمام کیا ہے۔ اُس کے لئے شکر گزار ہوں۔ مگر میری دست بستہ درخواست ہے کہ میری سکونت کے انتظام کرنے کی حضور کبھی زحمت گوارہ نہ کریں"

اس کا اشارہ قید خانہ کی طرف تھا۔

باسٹل سے نجات پانے کے بعد والٹیر نے اپنا مشہور ڈراما" اوڈیپ" لکھا۔ یہ ایک نہایت ہی دردانگیز قصہ ہے۔ بہت مقبول ہوا۔ اور مسلسل ۴۵ دن پیرس کے تھیٹروں میں دکھایا گیا۔ والٹیر کے والد کو اس کا حال معلوم ہوا۔ تو خاص اس کے دیکھنے کے لئے پیرس آیا۔ تماشہ دیکھتے وقت اپنی مسرت بار بار یہ کہہ کر ظاہر کرتا۔ آہ شیطان آہ شیطان؟

اسی ڈراما میں اُس نے اپنے یہ انقلاب انگیز خیالات ظاہر کئے تھے:۔

"ہمارے کاہن ویسے نہیں ہیں۔ جیسا سادہ لوح اور عوام انہیں سمجھتے ہیں"

"ان کاہنوں کے علوم و معارف کیا ہیں؟ دراصل ہماری سادہ لوحی اور زود اعتقادی ہی اُن کے علوم و معارف ہیں!"

"ہمیں اپنی قوت پر یقین کرنا اور ایمان لانا چاہئے۔ ہر چیز خود اپنی آنکھوں سے دیکھنی چاہئے۔ درحقیقت ہماری عقل ہی ہمارا معبود، ہمارا عبادت خانہ اور ہمارا کاہن ہے"

اس ڈراما سے والٹیر نے چار ہزار فرنک حاصل کئے۔ اُس نے یہ رقم ضائع نہیں کی۔ بلکہ اُسے اپنا راس المال قرار دیا۔ اور بڑی ہوشیاری سے اُسے بڑھاتا

رہا۔ اُس کا اصول تھا۔ کہ آدمی کو اپنی روزی اپنی محبت سے کمانی چاہیے۔ اور اپنی کمائی سے کچھ نہ کچھ پس انداز ضرور کرنا چاہیے۔ وہ کہا کرتا تھا: "فلسفہ چھانٹنے سے پہلے آدمی کو زندہ رہنے کی حکمت سیکھنی چاہیے"۔

کینن ویبسٹر

تھوڑا عرصہ گزرا ہے، لندن سے رئیوٹر ایجنسی نے یہ خبر تمام دنیا میں مشہور کردی تھی کہ برمنگھم کے لارڈ بشپ نے ویسٹ منسٹر میں تقریر کرتے ہوئے ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے، جس نے یورپ کے تمام کلیسائی حلقوں میں ہلچل ڈال دی ہے۔ اُس نے صاف صاف لفظوں میں اعتراف کرلیا ہے کہ پیدائش کائنات کا قدیم مسیحی اعتقاد (یعنی تورات کی کتاب پیدائش کا بیان) قابلِ ترمیم ہے، اور اب وقت آگیا ہے کہ ہم علمی تحقیقات کی مخالفت کرنے یا غلط مذہبی تاویلوں کے ذریعہ تطبیق دینے کی ناکام کوششوں سے باز آجائیں یعنی تسلیم کرلیں کہ تورات کی کتاب پیدائش کا بیان ایک گمانی سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے واقعہ کی خبر مشہور ہوئی یعنی بشپ جب سینٹ پال چرچ میں وعظ کررہا تھا تو اچانک ایک واقعہ نے تمام مجلس میں اضطراب پھیلا دیا۔

ایک طرف سے تیز صدا اٹھی ۔ "یہ بدعت و زندقہ کا معلم ہے"۔ لوگوں نے جب اُس طرف نظر اٹھائی، تو معلوم ہوا، پادری کینن ویبسٹر" غیظ و غضب کی شدت سے بے قابو ہو کر کھڑا ہو گیا ہے، اور وعظ کے کفر و زندقہ کا اعلان کر رہا ہے - اس پُر غضب طریقہ سے مجلس کو اپنی طرف متوجہ کر کے اُس نے بشپ پر لعن طعن کی بوچھاڑ شروع کر دی اور پھر یہ کہہ کر کہ "ایسے زندیق کا واعظ سننا جائز نہیں" اپنی جماعت کے ساتھ گرجے سے رخصت ہو گیا!

اب انگلستان کے اخبارات و رسائل میں اس معاملہ کی تمام تفصیلات آگئی ہیں ۔ دراصل یہ معاملہ بھی اُسی سلسلۂ بحث کی ایک کڑی ہے ۔ جو سر آرتھر کیتھ کی تقریر سے تمام یورپ اور امریکہ میں چھڑ گیا ہے ۔ بشپ آف برمنگھم کا نام ڈاکٹر بارنس ہے ۔ اس نے اسی تقریر کا حوالہ دے کر اپنے خیالات ظاہر کئے تھے ۔ معاملہ کا اہم اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ یہ اعتراف برطانوی کلیسا کے ایک بہت بڑے ذمہ دار شخص کی زبان سے ہوا ہے ۔ اُس نے بڑی دلیری کے ساتھ وہ خیال اعلانیہ ظاہر کر دیا، جو آج ہزاروں لاکھوں عیسائیوں کے دلوں پر ثبت ہے!

بشپ نے تقریر کرتے ہوئے کہا :-

اس عہد کے افسانوں سے متعلق میں کیا کہوں ؟ کیا یہ کہوں کہ قدیم عقیدہ ہی پر استوار رہو ؟ ہرگز نہیں ۔ میں ان سے جو کچھ کہہ سکتا ہوں، وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ حق کی تلاش کرو ۔ خوش رہو، کیونکہ تم ایک ایسی صدی کی مخلوق ہو، جو اپنی علمی ترقیوں کی وجہ سے تاریخ کی سب سے زیادہ عظیم الشان صدی ہے ۔ میں ان سے کہتا ہوں، جدید

انکشافات کا خیر مقدم بجا لاؤ ۔ علماء عصر کی تعظیم کرو ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھو کہ اس تمام علمی ترقی کے پیچھے ہم برابر ایک کثیف پردہ پڑا دیکھتے ہیں ۔ یہ پردہ ، زندگی کے تمام بنیادی مسائل کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے ، اور ہماری نظروں کو ان کی حقیقت معلوم کرنے سے روک رہا ہے ۔ تم پر فرض ہے کہ ان مسائل سے قریب تر ہو ، تمہارا قلب ایمان سے لبریز ہو جائے ۔ تمہاری رہبر عقل ہو نہ کہ خوش اعتقادی ۔ اگر تم ایسا کرو گے ، تو تمہارا ایمان ان دونوں جماعتوں سے مختلف ہو گا ۔ جس میں سے ایک نے مغرورانہ انکار کی اور دوسری نے جاہلانہ خوش اعتقادی کی غلطی کی ہے !"

سر آرتھر کیتھ کے خطبہ کے بارے میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے ؟ مذہب کو نشو و ارتقاء کے مقابلہ میں ہمارا مسلک کیا ہونا چاہیئے ؟ کیا ہم حقیقت کو جدل کے موٹے پردوں میں چھپا دیں ؟ میں تم سے آج یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تم اس روشن زمانے کی مخلوق ہو کر حقائق سے تجاہل نہیں برت سکتے" !

"کیا ہمارے لیے یہ جائز ہے کہ لوگوں کی عقلوں میں شک پیدا کر دیں ، حالانکہ یہاں شک کا کوئی موقعہ ہی نہیں ؟ کیا یہ مناسب ہے کہ مسیحی عقائد کی تاریخ محض اس لئے بدل دی جائے کہ ڈاردین کا مذہب نیا نہیں ہے ، پرانا مذہب ہے ؟ یا یہ مناسب ہے کہ جدید حقائق تسلیم کرتے ہوئے حقیقت کا صاف صاف اعتراف کر لیں اور تسلیم کر لیں کہ مسیحی عقائد کی بعض تقلیدی آراء قابل تبدیل ہیں ؟"

میرے خیال میں آخری تجویز بہتر اور مناسب ہے ۔ آؤ ، ہم بے خوف و خطر حقائق کا ویسا ہی خیر مقدم کریں ، جیسا کہ وہ علمی حلقوں میں اپنا خیر مقدم دیکھ رہے ہیں ۔ تمام اہل علم

متفق ہیں کہ انسان نے بندر کی ایک قسم سے ترقی کی ہے۔ ممکن ہے، انسان کی یہ ترقی دس لاکھ برس پہلے شروع ہوئی ہو۔ تمام حیوانی اصولوں نے مختلف سمتوں میں ترقی کی ہے، لیکن انسان کی حقیقی ترقی اس کے دماغ اور فکری مرکزوں میں واقع ہوئی ہے۔ اس لئے وہ اپنے ہم جنس حیوانوں پر بازی لے گیا۔ بندر کی دوسری قسموں نے اور قسم کی ترقی کی۔ چنانچہ بتدریج، شمپانزی، گوریلا، اورانگ اور اوتان کی قسموں نے ظہور کیا۔ یہ تمام بندر انسان کے قریبی عم زاد ہیں، علماء اس ترقی کی جزئیات میں کتنا ہی مختلف ہوں، لیکن کوئی دو مستند عالم بھی اس معاملہ میں اختلاف نہیں رکھتے کہ انسان نے بندر ہی سے ترقی کی ہے۔ اور یہ، کہ یہ ترقی ایک مسلم و ثابت حقیقت ہے۔ ڈاروین کا مذہب پچاس برس سے موجود ہے۔ اور پوری طرح صحیح ثابت ہو چکا ہے۔۔۔۔"

"علم الحیات کے مباحث سے ثابت ہو چکا ہے کہ شر اور برائی کا میلان انسان کی طبیعت میں فطری ہے، اور یہ اس نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں پایا ہے۔ یہ بالکل یقینی ہے کہ انسان، ایک حیوان ہی ہے۔ اور اپنے اعضاء اور روح میں بتدریج ترقی کر کے خالص حیوانیت سے اس درجہ تک پہنچ گیا ہو۔ وہ کوئی دیوتا نہ تھا، جو طہارت و تقویٰ کے لباس میں ملبوس آسمان سے زمین پر اتر پڑا ہو۔ انسان کی روحی ترقی ہی نے اسے باقی تمام حیوانات سے ممتاز کر دیا ہے"

"ہمیں ہمیشہ حق کی جستجو میں لگے رہنا چاہیئے۔ جب کبھی کسی حقیقت پر سے پردہ اٹھے، تو قدیم سے قدیم تقلیدی خیال کے بھی ترک کر دینے میں ہمارے اندر کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیئے اور نہ اس تبدیلی پر کسی طرح کا رنج محسوس کرنا چاہیئے۔"

جب کبھی کوئی حقیقت ظاہر ہوتی ہے تو ایک خاص قسم کے لوگ چلا اٹھتے ہیں: "ایمان خطرے میں پڑ گیا ہے!"

لیکن میرا تاریخی مطالعہ مجھے بتاتا ہے کہ ایمان صرف اُس وقت خطرے میں ہوتا ہے، جب عقل قید کر دی جاتی ہے اور دماغ پر مُہر لگا دی جاتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں "ہمیں مسیحی حقائق کو اُسی طرح محفوظ رکھنا چاہیے، جس طرح ہمارے عقائد چلے آتے ہیں"۔ لیکن میں من گھڑت حقائق کے وجود سے اپنی لاعلمی کا صریح اعلان کرتا ہوں۔ بعض لوگ کہتے ہیں "جدید خیالات کفر و الحاد ہیں" لیکن میں کہتا ہوں "آج کا کفر ممکن ہے کل کا ایک راسخ دینی عقیدہ بن جائے!"

"تمام وہ مسیحی جو تقلیدی بندشوں سے آزاد ہیں، جانتے ہیں کہ مذہب نشو و ارتقاء اور حقیقی مسیحی تعلیم میں کوئی نزاع نہیں ہے۔ کیونکہ خدا اپنی قدرت تدریجی ترقی میں بھی اسی طرح ظاہر کر سکتا ہے، جس طرح فوری تخلیق میں"

یہ پہلا موقعہ نہیں ہے کہ اس موضوع پر اس بشپ نے اظہار خیال کیا ہے۔ اب سے دو سال پہلے بھی اسی قسم کے خیالات ظاہر کئے تھے۔ اس زمانے میں امریکہ کے پروفیسر سکوپس پر اس لیے مقدمہ چلایا گیا تھا کہ اس نے ایک سرکاری مدرسہ میں اپنے شاگردوں کے سامنے ڈاروین کا مذہب پیش کر دیا تھا۔ اس مناسبت سے رسالہ "نیچر" نے بشپ مذکور سے اس مسئلہ کی نسبت استفتا کیا تھا۔ بشپ کا جواب حسب ذیل تھا:

"یہ جاہلانہ تعصب، جس نے مذہب نشو و ارتقاء کی تعلیم کو امریکہ کے سرکاری مدارس میں ممنوع قرار دے دیا ہے، ایک سخت مذموم تعصب ہے۔ میں آزادیِ خیال کا حامی ہونے کی

حیثیت سے نہایت ناپسند کرتا ہوں کہ ایک انگلو سکسن جماعت قانون کے زور سے علم کی اشاعت روکے۔ میں ایک مسیحی ہونے کی حیثیت سے ہر ایسی تحریک کو انتہائی رنج وغم سے دیکھتا ہوں، جو مسیحی دین کو معقول بنیادوں پر استوار کرنے سے روکتی ہے"

بے شمار دلائل سے ثابت ہو چکا ہے، اور متمدن دنیا میں ہر مستند عالم اس کا اعتراف کر رہا ہے کہ انسان نے ایک ایسی مخلوق سے ترقی کی، جو بندر سے مشابہ تھی، انگلستان میں ہر روشن خیال مسیحی کا اعتقاد یہی ہے۔ یہاں کے تمام مشاہیر لاہوتی علماء بھی اس رائے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ یہ اعتراف مسیحیت کو اور بھی زیادہ مستحکم کر دے گا۔ کیونکہ یہ اس روحانی اساس کو، جو ہم مسیح سے اخذ کرتے ہیں، اس درجہ معقول بنا دیتا ہے کہ کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا"

"ہم کتنا ہی انکار و مغالطہ کام میں لائیں، مگر مسیح کی تعلیمات سے جو عہدِ جدید میں موجود ہیں، ہرگز ثابت نہیں کر سکتے کہ عہدِ قدیم کی کتاب پیدائش حرف بحرف صحیح ہے۔ لوگ یہ بھول گئے کہ کتابِ مقدس روحی حقائق کا خزانہ ہے، نہ کہ تعلیم و تدریس کی کوئی علمی کتاب ہے۔ لوگ یہ مسیحی عقیدہ بھی بالکل بھول گئے کہ روح القدس برابر لوگوں کی عقلیں وسیع کرتی رہے گی تاکہ وہ حق تک پہنچ سکیں۔ یہ لوگ حق کے جاننے سے ڈرتے ہیں، کیونکہ سمجھتے ہیں، حق کے اعتراف سے مسیحی عقیدہ کمزور ہو جائے گا۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ علم کی اس مقاومت کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ ہزارہا طالب علم، مسیحیت کے دائرے سے یہ یقین کرتے ہوئے نکل جائیں کہ مسیحیت کی بنیاد سراسر جہل و خرافات پر ہے"!

ابوالکلام آزاد

کی

دو کتابیں

نوائے سروش ——— نوادرات آزاد

زیر طبع

★

مطبوعات ناشرین

مقامات اقبال	(ڈاکٹر سید عبداللہ)	۵/-/-
جادو اور جادو کی رسمیں	(رحمان مذنب)	۵/-/-
باون گزے	(ناول)	۶/-/-
برگ حنا	(احمد ندیم قاسمی)	۳/-/-
قرآن پاک کا مطالعہ کیسے کیا جائے	(عبیداللہ سندھی)	

ابوالکلام اکیڈمی
سادات سٹریٹ میکلوڈ روڈ ۔ لاہور



تاریخی شخصیتیں

ابوالکلام آزاد

ڈمی - سادات سٹریٹ - میکلوڈ روڈ - لاہور